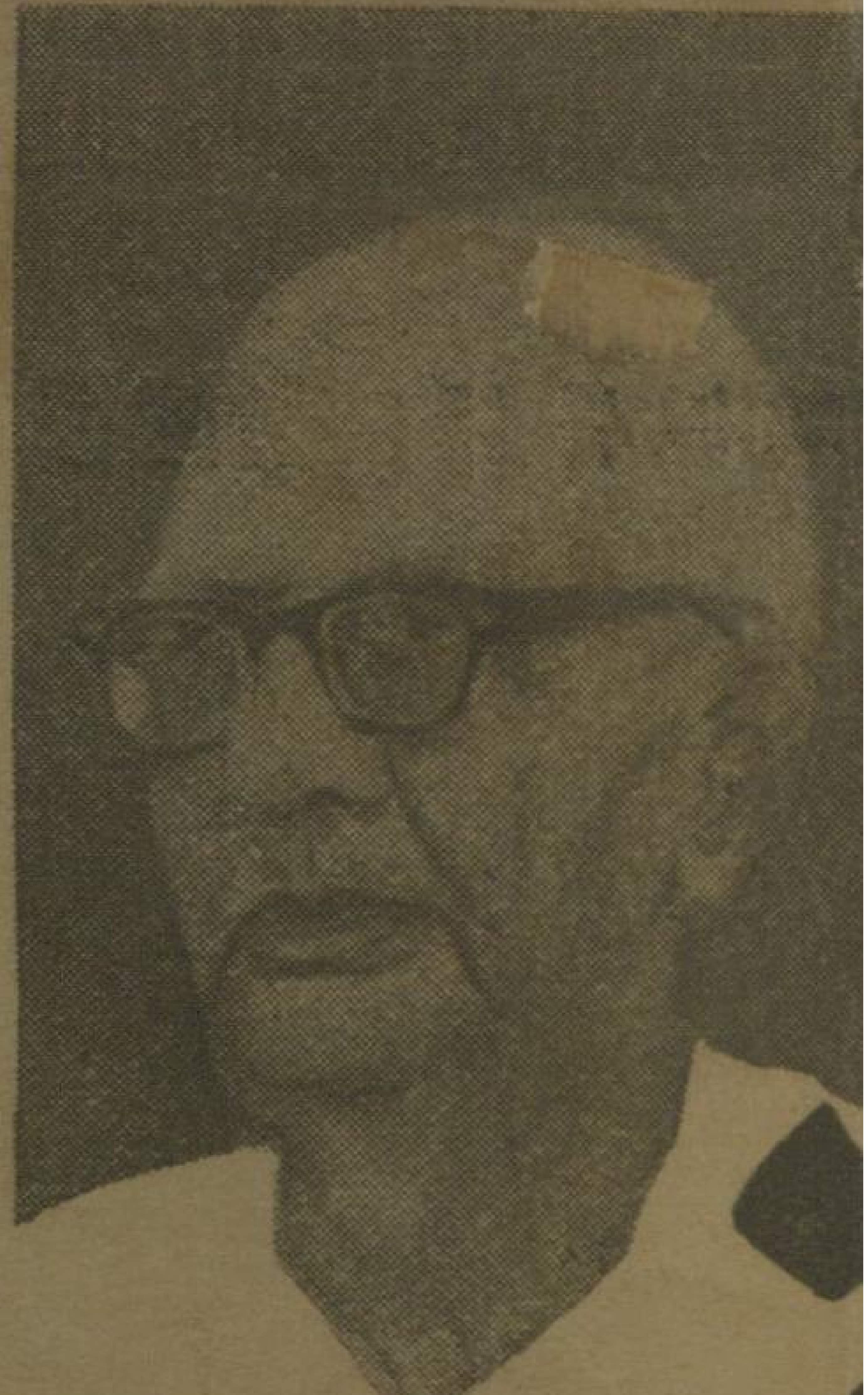


نیاز فتحپوری

مرتبہ

سید انیس شاہ جیلانی

حیرت شملوی اکادمی
محمد آباد - ضلع رحیم یار خاں - (مغربی پاکستان)



سید محمد شاہ جیلانی - انیس - ابوالکلام جیلانی - علامہ نیاز فتحپوری - بیگم نیاز



نیاز فتحپوری فتحِ بابِ علم و انشا تھا
تصرف میں تھے اُس مرحوم کے لوح و قلم دونوں
رئیس امروہوی ہو یا انیسِ شاہ جیلانی
"نیازِ ناز آگیں" کے نیاز آگیں ہیں ہم دونوں

رئیس امروہوی

نیاز فتحپوری

۱۸۸۴ء-۱۹۶۶ء

مُرتّبہ

سید انیس شاہ جیلانی

یکے از مطبوعات

حیرت شملوی اکادمی

محمد آباد۔ ضلع رحیم یار خاں

مغربی پاکستان

یکے از مطبوعات

حیرت شملوی اکادمی

جملہ حقوق محفوظ — سلسلہ مطبوعات نمبر ۲

اشاعت اوّل — ۱۹۶۹ء ۱۳۸۸ھ

ناشر — حیرت شملوی اکادمی

طابع — تجارتی پریس سکھر

کتابت — رفیعہ بیگم

باہتمام — اقبال ہاشمی

قیمت

ملنے کا پتہ
حیرت شملوی اکادمی
محمد آباد ڈاکخانہ سنجر پور ضلع رحیم یار خاں
مغربی پاکستان

الفہرست

پیش لفظ

نیاز سے میرا معاملہ خوردی بزرگی کا تھا، اے
کاش وہ میرے یار راز دار ہوتے تو بہت سی گفتنی و ناگفتنی اگلوا لیتا،
خلوتیانِ راز کی پوری ایک کھیپ برصغیر پاک و ہند میں موجود ہے
مگر مہر بلب،

میں نے یہ مضمون اٹکل پچو جوڑ تو لیا۔ لیکن مسئلہ یہ
درپیش کہ اب چھپے کہاں، میں اسی فکر میں غلطاں و پیچاں جی بہلاتا تھا ناگہاں
اقبال ہاشمی
مسیحا بن کر نمودار ہوئے اور اسے بجائے کسی ماہنامے کے کتابی صورت
میں لانے کی ترغیب دی۔ لہٰذا سزاوارِ تحسین و نفرین ہیں تو یہی ہاشمی
ہوں تو ہوں۔

انیس
۶ر فروری ۱۹۶۹ء

انتساب

ڈاکٹر غلام جیلانی برق

کے

نام

جناب پروفیسر دلشاد کلانچوی کی نذر کرتا ہوں

رائے عالی کا منتظر

خاکسار

اشس

۱۵/ اپریل ۱۹۷۰ء

بہاولپور

یکے از کافرے کافر مسلماں

ہوش کے ناخن بھی نہ لئے ہوں گے کہ نیاز نیاز کی پکار کانوں میں پڑی، برصغیر پاک وہند میں بہت کم کیا معنی شاذ ہی کسی کو یہ اعزاز حاصل ہوا ہو کہ پوری ایک نسل کی ذہنی دنیا تہ وبالا کر کے رکھ دی دماغ سے پھوٹنے والے سوتے یوں اپنا رخ بدلتے ہوئے کبھی نہیں دیکھے گئے نیاز نے جس دھڑلے اور ٹھسے سے اپنے مذہبی سیاسی علمی ادبی افکار کو، الم نشرح کیا اس کی پیمبرانہ شان سے کسے انکار ہو سکتا ہے انکی لپیٹ میں نوعمر ہی نہیں ہم عمر اور ہم عصر یکساں آئے کس کی مجال تھی کہ دامن سمیٹ کر یا آنکھ بچا کر نکل جاتا نیاز نے خلائق کے ذہنی خلفشار روحانی کرب اور اوہام پرستی کے عفریت سے جس تگ وتاز جرأت اور پرشکوہ انداز میں نجات دلائی ہے یہ کچھ انہی کا حصہ تھا خدا کا فرسودہ تصور جو ہماری ذرا ذرا سی بات پر خوش ہوتا اور تیوریاں چڑھا لیتا ہے۔ نیاز کے قلم کی نشتریت کی تاب نہ لا کر یہ بت پاش پاش ہو کر رہ گیا اور خدائے عظیم کا وہ حقیقی اور سچا روپ سامنے آیا جس کا وہ مستحق ہے جو بے نیاز مطلق ہے وہ ایک قوت ہے جو نظامِ عالم کے قیام کی ذمہ دار ہے اور جو اصول اس نے مقرر کر دیئے ہیں ان میں تبدیلی ممکن نہیں۔ نیاز کا تصورِ اسلام بھی عام روش سے ہٹ کر اور بےجا نہیں بجا ہے، یہ

ذہنی انقلاب مرہونِ منت تھا ایک تو ان کی قبل از وقت نچتہ ہو جانے والی فطرت اور دوسرے ان کے استادوں مولانا سید ظہور الاسلام صاحب محرک ندوۃ العلماً وبانی مدرسہ اسلامیہ فتح پور اور مولانا نور محمد صاحب مدرس اعلی شاخ عربی مدرسہ اسلامیہ فتح پور کے طبائع کے تضاد کا متناسب معلوم ہوتا ہے ہر دو حضرات کے بارے میں جناب نیاز ہی کی زبانی کچھ سن لیا جائے۔

"یہ (نور محمد) پنجاب کے کسی مقام (شاید قصور) کے رہنے والے تھے اور اس میں شک نہیں کہ بڑے متقی انسان تھے لیکن سراپا ہیبت وجبروت یکسر تقشف وعبوس، برخلاف اس کے مولانا ظہور الاسلام بڑے رقیق القلب انسان تھے وہ فارسی کا بھی بڑا اچھا ذوق رکھتے تھے اور ان کے اس ادبی رجحان نے ان میں زاہدانہ احتساب و دارو گیر کے بجائے بہت نرمی اور عفو درگزر کی کیفیت پیدا کر دی تھی
(نگار نیاز نمبر حصہ اول ص ۲۴)

اس کے علاوہ مولوی نور محمد انگریزی تعلیم کے بھی سخت مخالف تھے ان کی غیر موجودگی میں جب ٹاٹ اور بوسیدہ دری کی جگہ کرسی اور بنچوں نے لے لی تو یہ دیکھ کر وہ آگ بگولا ہو گئے اور ہر چیز اٹھا اٹھا کر باہر پھینکدی، اس شاندار اسلامی مظاہرے کو بھی مولانا ظہور متانت اور خوش اسلوبی سے جھیل گئے انگریزی کا شعبۂ تعلیم علیحدہ کر کے خود اس کے نگراں ہو گئے عربی شاخ کے مختار کل نور محمد صاحب کی سختی کا یہ عالم کہ لڑکوں کو سخت جسمانی

تکلیف پہنچانے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے، درس و تدریس کا انداز بھی انتہائی سپاٹ اور کھردرا تھا بقول نیاز "ہمیشہ شروح و حواشی سے مدد لیتے اور کوئی بے ساختہ تقریر کسی علمی موضوع پر نہ کر سکتے تھے" بد آواز ایسے کہ ان کے اقتدا میں نماز پڑھنے کا لطف اکارت ہو جاتا، البتہ مولانا ظہور کے لہجے کی نرمی رقت اور لحن کا دل پر اثر ہوتا، درس کے دوران میں لڑکے لب کشائی سے ڈرتے" اور جو کچھ وہ بتاتے چپ چاپ سن لیتے اس پر بھی نیاز سوال کرنے سے نہ چوکتے جواب کبھی تسلی بخش نہ پاتے، مولانا نور محمد حج کو تشریف لے گئے تو ان کی جگہ پر تقرر مولانا محمد حسین کا ہوا یہ "حد درجہ مغلوب الغضب اور خشک اور عبوس" آتے ہی حدیث پر زیادہ زور دیا اور مشکوٰۃ کی بعض احادیث مثلاً ایک اژدہے کے سانس کھینچنے اور چھوڑنے پر گرمی سردی کا انحصار، سن کر نیاز باوجود ضبط کے "غلط" پکار اٹھے اور اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ معتوب ہی کی زبان سے اچھا لگے گا۔

"یہ سنتے ہی مولانا کا یہ حال ہوا جیسے ان پر کوہ آتش فشاں پھٹ پڑا ہو اور بولے کہ "بدتمیز تو رسول اللہ کو غلط کہتا ہے میں نے عرض کیا کہ "میں رسول اللہ کو غلط نہیں کہتا بلکہ اس حدیث کو غلط کہتا ہوں کیونکہ رسول اللہ کبھی ایسی خلاف عقل لغویات نہیں کہہ سکتے تھے" اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا نے اپنا ڈنڈا اٹھایا اور میں اٹھ کر بھاگا"۔

اور یہ بعض دیگر مسائل پر رد و کد کے نتیجے میں پہلے بھی ہو چکا تھا،

ناظرین کو ناگوار خاطر نہ ہو تو اتنا میں بھی کہتا چلوں کہ مشکوٰۃ کے اردو ترجمہ میں یہ پڑھ کر بڑی الجھن ہوئی تھی کہ ایک صحابی رسول اللہ کے یہاں کسی ضرورت سے گئے حجرہ خالی تھا اور یہ پیاسے ایک پیالے میں پانی دیکھ کر غٹا غٹ چڑھا گئے پیالہ ان کے ہاتھ ہی میں تھا کہ حضورؐ تشریف لے آئے فرمایا یہ تم نے کیا کیا یہ تو میرا پیشاب تھا لیکن خیر جو ہوا سو ہوا اس سے تمہارا سینہ روشن ہو گا اب آپ اندازہ لگائیے اول تو یہ آداب معاشرت کے خلاف تھا کہ بغیر اطلاع کسی کے خیمے یا حجرے میں کوئی جا گھسے جب کہ حضرت علی اپنی بیٹی تک کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹاتے نظر آتے ہیں، دوسرے افراد خانہ کی عدم موجودگی میں ساز و سامان سے چھیڑ چھاڑ بھی قابل ستائش کہاں پھر رسول اللہ کا ایک صاف ستھرے برتن میں پیشاب کرنا اور با اہتمام سامنے دھرا رہنے دینا اور اسی پر بس نہ کرنا بلکہ یہ تک کہہ گذرنا کہ تم پی گئے کچھ برا نہ ہوا رسول اللہ کی پاکیزگی کے اظہار کا یہ طریقہ کراہت سے خالی نہیں اور اس سے اجتناب بہتر ہے ایک "پیدائشی مسلمان" تو طرح دے سکتا ہے ایک غیر مسلم کو آپ اس قسم کی مثالیں دے کر کیونکر باور کرا سکتے ہیں کہ آپ کا فرمایا ہوا مستند ہے اور عام اخلاقی اقدار سے ہٹ کر نہیں ہے کتب احادیث کا وہ حصہ جو اخلاقیات اور زندگی کرنے کے مسائل پر مشتمل ہے الگ کر لیا جائے یہ ایک گراں بہا خدمت ہو گی انسانیت کی۔

مدرسہ اسلامیہ فتح پور کا حافظ خانہ جسے نیاز مرحوم نے مذبح سے تعبیر کیا ہے جہاں بچوں کی کھال اس طرح ادھیڑی جاتی تھی کہ ان کی چیخ و پکار

اور آہ و بکا سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے بقول نیاز

"استادوں کی سخت گیری طبعی کرختگی زبان بندی مذہبی تقشف رعونت فرعونی انداز گفتگو اور یہ عقیدہ کہ مذہب کو عقل سے کوئی لگاؤ نہیں ان کا یہ پندار کہ وہ عام سطح سے بہت بلند ہیں اور ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ انہیں دیکھتے ہی سربسجود ہو جائے میرے تجربات مولویوں کے باب میں تلخ سے تلخ تر ہوتے گئے میرے اندر مذہب کی طرف سے ایک خاص کیفیت احتراز پیدا کر دی تھی اور یہیں سے مذاہب کے تقابلی مطالعے کا شوق پیدا ہوا مختصر یہ کہ اپنی زندگی میں سب سے زیادہ اثر میں نے جس کا لیا وہ مولویوں کی جماعت تھی لیکن یہ اثر بالکل منفی قسم کا تھا یعنی میں ان سے متاثر تو ہوا مگر یہ تاثر ایک نوع کا انکاری تھا اور اس لحاظ سے میں ان کا شکر گذار ہوں کہ اگر ان سے مجھے واسطہ نہ پڑتا تو نہ میں اپنے مذہبی مطالعہ میں وسعت پیدا کر سکتا تھا اور نہ مسائل مذہب میں صرف عقل کا سلیقہ مجھ میں پیدا ہوتا۔"

اس پس منظر کو دیکھتے ہوئے شوکت سبزواری کی زبان میں کہنا پڑتا ہے کہ وہ نیاز کے اسلام کی بنیاد فکر پر ہے اور ایک عام مسلمان کے اسلام کی بنیاد جذبے پر۔" جذبات کی پرشور سطحیت اور خیال و فکر کی گہرائی اور گیرائی بہرحال مسلّم ہے۔ میں یہاں یہ کہے بغیر کیونکر گذر سکتا ہوں کہ نیاز

کو صحیح راستہ پر ڈالنے میں بڑا ہاتھ ان کے والد کی آزادہ روی علمی بصیرت اور شعری ذوق کا بھی رہا ہے۔

تکمیل تعلیم درسی کے بعد پولیس اور دیگر مختلف وادیوں میں بھٹک بھٹکا کر بے چین اور مضطرب روح کو پہلوئے نگار میں آخر قرار آ ہی گیا یہاں ان کے جوہر کھلے اپنے نظریات اور معتقدات کی اشاعت کا سلسلہ بھی جاری کر دیا، نیاز کے آرا کی زد چونکہ ملاؤں کے فرسودہ خیالات معتقدات اور خود ساختہ روایات خصوصاً حلوے مانڈے پر پڑتی تھی اس لئے چہار سو محاذ قائم کر دیئے گئے اور بعض حضرات تو اخلاقی حدود سے بھی تجاوز کر گئے دلیل کا جواب بن نہ پڑا تو اینٹ پتھر ہاتھوں میں لے لئے قتل کی دھمکیاں دی جانے لگیں ہر شریف اور باغیرت انسان کی طرح نیاز بھی اپنی حفاظت کرنا خوب جانتے تھے وہ اس میدان کے بھی مرد ثابت ہوئے مگر کسی کی "ہمت مردانہ" ان کے گریبان تک تو کجا دامن کو بھی نہ چھو سکی، ورنہ وہ خنجر اپنے جوہر ضرور دکھاتا جو اس ہنگامی حالت میں مطالعے کی میز کی دراز میں عریاں رکھا رہتا تھا، کفر کے فتوے گھڑے گئے مقدمات دائر ہوئے اور جب یہ علم ہوا کہ نیاز تو ہماری من گھڑت روایات کے بخیئے ادھیڑ دیگا اور بر سر عدالت مناظرے کے لئے ہمہ تن تیار ہے برصغیر کے کم و بیش سبھی علمار کو کھینچ بلائے گا اور عبا و قبا کو تار تار کر ڈالے گا تو کھٹ سے واپس بھی لے لئے گئے جبہ و دستار کے پیچ و خم دستاویزی ثبوت تردیدی سے دھڑا دھڑ نکالے جانے لگے تو ایمانوں کی سلامتی کے لئے جا بجا نگار کا داخلہ

اور اب تو بعض حقائق کا اظہار خود انہی کے قلم سے ہو رہا ہے جن کی فرشتہ سیرتی کی دھوم مچی ہوئی تھی مثلاً ماہنامہ نقوش کے آپ بیتی نمبر میں مولانا عبدالماجد دریابادی نے بڑے رکھ رکھاؤ اور چاؤ سے اپنی موجودہ ازدواجی زندگی کی تصویر کشی تو کر ڈالی مگر [illegible]

ممنوع قرار دلوا کر روڑے اٹکائے گئے یہ نیازی کا دل گردہ تھا کہ تن تنہا جو کبھی لڑتا رہا دکن میں نگار کے داخلہ پر پابندی کا ذکر والد صاحب کے نام ایک خط میں بھی آیا تیور ملاحظہ فرمائیے۔

"بیشک نگار کا داخلہ حیدرآباد میں ایک سال کے لئے ممنوع قرار پایا ہے لیکن گھبرایئے نہیں نگار برابر اسی طرح جاری رہے گا میں دکن جا کر کوئی کوشش نہ کروں گا کیونکہ مجھے ان سب کو بتا دینا ہے کہ نگار کی زندگی کا مسئلہ حیدرآباد وغیرہ کے خریداروں سے بہت بلند ہے نقصان ہوا ہے اور ہوگا لیکن میں اس نقصان سے ہمت نہیں ہار سکتا" [۲]

ہمت استقلال صبر و ضبط سے ناگہانی آفات کا مردانہ وار مقابلہ کرتے رہے مگر جب معاملہ عالمانہ بحث و نظر تدبر و تفکر اور تعقل سے نکل کر جہالت وحشت اور بربریت کی حدود میں جا پہونچا اور عرصۂ حیات تنگ کر دینے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی گئی تو دفعِ شر کے لئے ایک "توبہ نامہ" شائع کر دیا گیا جس پر خوب بغلیں بجائی گئیں یوں اس آگ کو وقتی

---

[۱] (صفحہ ۱۲ سے آگے) ـــ ہیں تین مہینے تختۂ مشق بنائے رکھنے کے بعد شریعت اسلامی میں والدین کے احکامات کی افضلیت کا جواز پیدا کر کے چلتا کیا۔

---

[۲] ایسے آڑے وقتوں میں مالک رام نے کہ جن کا ذوقِ قرآنی گویا عطیۂ نیاز و نگار ہے کچھ سلوک کر دیا تھا جس کا قصہ وہ مرحوم اپنے حالات میں لے بیٹھے تھے یعنی ایک "کافر" کا دوسرے "کافر" کا منت کشِ احساں ہونا۔

اپنی موجودہ ازدواجی زندگی کی تصویر کشی تو کر ڈالی مگر وہ اس مظلومہ کا ذکر پی گئے جسے نکاح کی آڑ میں

طور پر ٹھنڈا کیا گیا، نیاز فرماتے ہیں۔

"میں نے صلح حدیبیہ کے تتبع میں ایسا کیا ہے۔ اسوقت کا تقاضا یہی تھا کہ عارضی طور پر جارحانہ اقدام چھوڑ کر خموشی سے اپنی طاقت کو پھر سے مجتمع کیا جائے"۔

بچپن لڑکپن چھپٹن بھی کہہ لیجئے "نگار" کے فائل الٹتے پلٹتے گذرا اور اب بھی جس غائر مطالعہ کی ضرورت ہے اس کی توفیق کہاں ہو پائی ہے غرض زندگی کے ہر دور میں نیاز کو رگِ جان سے زیادہ قریب پایا گویا یہ سلسلہ روحانی تھا گوشت پوست کے نیاز کو دیکھنے کی سعادت پندرہ ہی برس کی عمر میں حاصل ہو گئی والد محترم سید مبارک شاہ جیلانی دنیائے ادب میں میرے امام کی حیثیت رکھتے ہیں کا وجود سرزمیں بہاولپور کی خزاں رسیدگی میں گلِ نوبہار سے کم نہیں۔ ان کے ۱۹۲۶ء سے قائم کئے ہوئے کتب خانہ (مبارک اردو لائبریری) کی سیر دیکھئے اس دور میں کہ ایٹمی دور کہلاتا ہے سال بھر میں ایک ہی آدھ دیوانہ آنکلتا ہے تو ۱۹۳۳ء میں اس کے سہ ماہی نقیب "لالہ صحرا" کو کون پوچھتا۔ جس میں اس وقت کی تقریباً سبھی مشہور شخصیتوں نے قلمی شرکت فرمائی تھی ایسی غیر شاعرانہ فضا کو ذہن میں لائیے اور ۱۹۲۵ء کا تصور کیجئے اور والد صاحب کے سفر لکھنؤ کو دیکھئے تو قبلہ کے عشق نیاز کے انتہائی مدارج پر ایمان لانا پڑتا ہے یہ کیونکر ممکن تھا کہ ۱۹۵۲ء میں وہ کراچی تشریف لائیں اور والد صاحب دیدار یار سے محروم رہیں، مجھے بھی ساتھ لے لیا گیا میں اور ابا جب سوئے منزل جاناں چلے ہیں تو سلیمانی ہراول دستہ کے ساتھ

ادیب شہیر سید رئیس احمد جعفری ندوی مرحوم و مغفور ہمارے ساتھ تھے اور متامل کہ اگر آپ کا معاملہ نہ ہوتا تو میں نیاز سے کبھی نہ ملتا، عقائد کے اختلاف پر یہ اخلاقی ردعمل میری سمجھ سے بالاتر تھا، ممکن ہے وہ ، وارِدی میں ایسا کہہ گذرے ہوں ورنہ وہ نیاز کی عظمت کے دل سے قائل تھے اس کا اندازہ مجھے یوں ہوا کہ ۱۹۵۵ء میں ایک خط جب ان کے نام گیا تو اسے اپنے روزنامچہ[1] میں نقل[2] کرنا ضروری سمجھا کچھ مضائقہ نہیں اگر اسے یہاں بھی نقل کر دیا جائے یہ وہ زمانہ تھا جب ظفر علی خان کے "زمیندار" کی ادارت زبردستی اختر علی خاں جنابِ جعفری کو سونپ چکے تھے اور آج ظفر علی خاں اختر علی خاں رئیس احمد جعفری زمیندار کوئی بھی باقی نہ رہا۔

"نیاز صاحب کا آج [۳۰۔ اگست ۵۵ء] بڑے مزے کا خط لکھنؤ سے آیا ہے"

---

[1] اس روزنامچہ کے حصول کے لئے میں نے شدید ترین جاڑوں میں لاہور کا سفر اختیار کیا۔ علی الصبح پہونچا تو معلوم ہوا کراچی سے چل کر ملتان اتر گئے تقریباً گیارہ بجے ملتان سے لاہور پہنچے، پوچھا کیونکر آنا ہوا مدعا سن کر فرمایا دیدوں گا میں نے کہا آج ہی شام کو واپسی کا ارادہ ہے مسکرائے اور اسی وقت چند صفحات جو رہ گئے تھے مکمل کر کے دے دیئے اب کہاں لوگ اس محبت کے۔

[2] عام طور پر جعفری مرحوم معاصرین تو کیا متاخرین اور متقدمین کے خطوط بھی محفوظ نہیں رکھتے تھے، مولانا عبدالماجد دریابادی کے خطوں کا ایک بڑا ذخیرہ یہ کہہ کر مجھے عطا فرما دیا۔" اب کہاں تک سنبھالتا رہوں تم اپنے پاس رکھ لو" یہ مجموعہ ان شاء اللہ کتابی صورت میں بہت جلد پیش کر دیا جائے گا، اس کے علاوہ دیگر مشاہیر عصر کے مکاتیب بھی وقتاً فوقتاً بطور خاص مجھے میرے ذوق مکتوب اندوزی کے پیش نظر دیتے رہے۔

نگار لکھنؤ
25-8-55

گرامی عزیز

زمیندار آپ کی ادارت میں نکلے اور میں اسے نہ دیکھ سکوں قیامت ہے مولانا اختر علی خاں اور زمیندار دونوں پر میرے دیرینہ حقوق ہیں اس لئے یوں بھی میں اسکے مطالعہ کا مستحق ہوں آپ سے ملنے کو بہت جی چاہتا ہے دیکھئے کب موقع ملتا ہے

آسودہ شبے باید و خوش مہتابے
تا با تو حکایت کنم از ہر بابے

نیاز"

یہی نہیں نیاز نمبر میں ایک بہت اچھا انسان اور بہت اچھا مسلمان بھی لکھ چکے ہیں، نیاز جعفری مجادلہ نگار میں بہار دکھا چکا تھا، اور جعفری صاحب کے مضامین میں جو دیبانہ شان پائی جاتی تھی اس کی تعریف اور مداحی کا اعلان بھی ہو چکا تھا اس لئے جب عبدالواحد سندھی کتب خانہ تاج آفس (بندر روڈ کراچی) جو اب مرحوم ہو چکا ہے میں یہ کہہ کر لے گئے آیئے آپ کو جعفری صاحب سے ملاؤں تو والد صاحب کا پہلا سوال یہی تھا، کیا آپ وہی "نگاری جعفری" ہیں جواب نفی نہیں اثبات میں ملا اور پھر بات ان کے نانا ریاض خیرآبادی تک پہونچی جن سے والد صاحب سفر لکھنؤ میں مل چکے تھے اور آج تک رطب اللسان ہیں کہ ریاض سے بڑھ کر انسان دوست اور شریف النفس آدمی شکل سے ملے گا والد صاحب کے

نام ریاض کے خطوں سے بھی یہ بات ظاہر ہو کر رہتی ہے میں یہاں ایک "ریاضی" لطیفہ لکھے بغیر نہیں رہ سکتا اس کی عبارت یوں اور ہو رہی ہے کہ والد صاحب ممکن ہے اپنی وضعداری کو اس طرح نباہ جائیں کہ سرے سے اسے قلم بند ہی نہ کریں جیسا کہ ایک بار فرما بھی چکے ہیں ان کا خیال ہے کہ اس سے ریاض کی ہیٹی ہو گی اور عیب جوئی سے پردہ پوشی زیادہ افضل ہے مگر میں عیب بینی کو صنف حقیقت نگاری اور صاف گوئی سے علیحدہ کوئی چیز نہیں سمجھتا اس سے تعمیر شخصیت کے تدریجی ارتقاء کے مطالعہ کا موقعہ ملتا ہے اور آدمی کو انسان ہونا میسر ہو جاتا ہے اور ریاض کی تردامنی تو آپ دیکھیں گے کہ۔

دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

ہاں تو ریاض، والد صاحب قبلہ کو لکھنؤ کی سیر دکھاتے ہوئے ایک بالاخانہ کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے یہاں ایک ماہ لقا رہا کرتی تھی بے اختیارانہ سیڑھیاں طے کر کے اوپر پہنچا، حیا وادا کے لطف اٹھانے کی دیرینہ تمنا کو شرمندۂ وصال کرنا چاہا مگر اس رخِ رنگین کی تابانی سے سدھ بدھ کھو بیٹھے جیسے گئے تھے ویسے ہی پلٹ آئے ہنستے جاتے اور یہ واقعہ سنائے جاتے تھے، زبان پر اس جملے کی تکرار

"خدا رعبِ حسن سے بچائے" خدا رعبِ حسن سے بچائے۔ حادثہ گزند پا شبلی تو آپ اپنے دام میں صیاد آگیا کا مظہر نہیں یا کھنڈ تھا حقیقت یہ ہے کہ گولی لگی اور نے جلالی حسن اتفاق سے نشانہ خطا گیا اور جان بچ گئی اس قسم کے اسباب پیدا کر لینا شبلی کی رنگینیٔ طبع سے کچھ بعید بھی نہیں تھا پھر کیوں ہم ریاض کی روایت کو ضعیف گردانیں

بچہ باغ کے پچھواڑے بلند بالا عمارت کی تیسری منزل کا دروازہ اسی کمرے میں کھلا جس میں حضرت نیاز لیٹے ہوئے "ریڈرز ڈائجسٹ" پڑھ رہے تھے پلنگ اور فرش،

پر بھی ڈائجسٹ بکھرے پڑے ہیں ممکن ہے ذائقہ بدلنے یا نگار کا پیٹ بھرنے کے لئے کچھ مواد چھانٹ رہے ہوں جسے بغیر حوالہ کے چھاپ دینا ان کے یہاں روا تھا بلکہ لوگ تو یہ کہتے ہیں پوری پوری کتابیں ترجمہ کرکے اپنے نام سے شائع کر دیا کرتے تھے یہ ملاقات پچیس سالہ طویل وقفے کے بعد ہو رہی تھی اس لئے خاصی جذباتی رہی گھنٹہ بھر کی نشست میں پرانی یادیں تازہ کی جاتی رہیں اور کسی امریکن صحافی کے اس شگفتہ تبصرے پر تبصرہ ہوتا رہا کہ "یہاں آکر خدا کے وجود کا اقرار کر لینا پڑتا ہے اس لئے کہ نہ تو یہاں کوئی قانون ہے نہ کوئی کام کرنے والا" ذکر خیر مولانا مودودی کا بھی آیا فرمایا میرے شاگرد ہیں بلاؤں تو آنے میں پس و پیش نہ کریں گے یہ اور بات ہے کہ "نیاز نمبر کیلئے فرمائش مضمون کا الٹا سا جواب (بنام فرمان فتحپوری) دے کر رہ گئے جس پر نیاز تڑپ اٹھے اور اس کا ماتم باوجودیکہ نیاز نمبر کی ترتیب و تدوین سے اظہار بے تعلقی کر چکے تھے نیاز نمبر کے بعد کے شمارے میں بڑے دردانگیز طریقے پر کیا جی چاہتا ہے اس کی تلخی میں جو حلاوت کا مزہ ہے تھوڑا سارا ہم بھی چکھ لیں۔

"اب المیہ کی روداد سنئے:- فرمان صاحب نے باوجود میری مخالفت کے ابوالاعلیٰ مودودی کو بھی خط لکھا اور جس کا جواب ان الفاظ میں موصول ہوا۔

آپ کا عنایت نامہ ملا میری صحت آج کل اتنی خراب ہے کہ اپنے بہت ضروری کام بھی انجام دینے سے قاصر ہو رہا ہوں اس لئے تعمیلِ ارشاد سے معذور ہوں۔

ا؎ پکچر پیلس "کراچی" کے پرانے سینما گھروں میں سے ایک تھا اپنی وضع قطع اور تراش خراش کے اعتبار سے الگ تھلگ، افسوس اسے منہدم کر کے پیٹرول پمپ بنا دیا گیا ہے، بندر روڈ پر میونسپلٹی کے قریب۔

عبدالماجد صاحب نے تو خیر اپنے خط میں ایک جگہ میرا نام بھی لے لیا ہے لیکن ابوالاعلیٰ نے تو یہ بھی گوارا نہ کیا غالباً اس لئے کہ وہ بھی مجھے کافر و ملحد سمجھتے ہیں بھلا اسکا اب سے تقریباً نصف صدی پہلے کی بات ہے کہ ابوالاعلیٰ اور ان کے بڑے بھائی ابوالخیر دونوں کا طویل زمانہ تعلیم۔ (جب دام ہمرنگ زمیں بود) اسی کافر و ملحد کی صحبت میں بسر ہوا ہے اور سب سے پہلے نگار ہی نے انہیں روشناس خلق کیا ہو سکتا ہے کہ بھوپال کی وہ رنگین شامیں جب تاج محل کے تالاب میں وہ اور میں دونوں ایک ہی کشتی میں بیٹھ کر پانی سے کھیلتے ہوئے گذر جایا کرتے تھے انہیں فراموش ہو گئی ہوں اور روز و شب کے علمی و ادبی مذاکرات جن سے ان کے ذہن کی تعمیر ہو رہی تھی ان کے دل سے محو ہو گئے ہوں لیکن میں اس لطیف زمانہ کی یاد کبھی نہیں بھلا سکتا اور اس وقت بے اختیار مجھے مومن کی ایک مشہور غزل یاد آ رہی ہے (ابوالاعلیٰ کو یاد ہو کہ نہ یاد ہو) مجھ کو ابوالاعلیٰ (مولانا مودودی نہیں) اب بھی اسی طرح عزیز ہیں اور غالباً ہمیشہ رہیں گے۔

دوست بودی شکوہ سر کردم ولے جرم تو نیست

کایں ہمہ بیداد بر من از دل تنگ من است

یہ تو ہوئی ۶۳ء کی بات ۳۳ء میں "ترجمان القرآن" کی ادارت جب مولانا مودودی نے سنبھالی تب بھی تبصرہ کرتے ہوئے کچھ اسی قسم کے احساسات و جذبات کا اظہار کیا تھا جس میں دلی لگاؤ بھی موجود ہے۔

"مولوی ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کو میں اس وقت سے جانتا ہوں جب ان کا جاننے والا صرف میں ہی تھا اور اس لئے میں اچھی طرح واقف ہوں کہ باوجود قدامت پسند ہونے کے وہ بہت سلجھی ہوئی طبیعت رکھتے ہیں"

دیکھا آپ نے وہ جو انتہائی بددماغ سخت گیر اور اکل کھرا مشہور تھا جس کی سخت جانی ہنگامہ آرائیوں یلغاروں معرکوں کے چرچے تھے کیسا کچھ رقیق القلب نکلا احباب خصوصاً جن سے ایام شباب میں یاد اللہ رہی ہوگی بے توجہی ہلا کر رکھ دیتی ہے" المیہ کی روداد" پر غور فرمایئے پھر نام نہ لینے کا جبر کا کشتیوں میں مل بیٹھنے کی یاد رات رات بھر کے راز و نیاز دل پر اک چوٹ سی لگی ہوگی اور حرف حرف میں اک جہانِ معانی پنہاں ہو کر رہ گیا مولانا کے تجاہل عارفانہ اور تغافل بے رحمانہ نے جس کرب و اذیت سے نیاز کو دوچار کیا اس پر بے ساختہ رئیس امروہوی کا یہ شعر زبان پر آجاتا ہے۔

جان لیوا سہی جراحت عشق

عقل کا زخم ہے بہت کاری

رونا مولانا عبدالماجد دریابادی کا بھی رویا گیا مگر وہ چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد کے سوا اور کچھ نہیں" من و یزداں" مرتب کرتے وقت نیاز صاحب کو شوق چرایا کہ اس پر کسی سے مقدمہ لکھوایا جائے تو کیا رہے وہ غالباً یہ بھول گئے کہاں پر مقدمہ دائر تو کیا جا سکتا تھا لکھنے کی ایک ہی رہی، شوخی ملاحظہ ہو اس کار خیر کے لئے مولانا دریابادی ہی کو منتخب کیا گیا صاحب "صدق" یہ مجھے اپنا قصیدہ لکھوانا چاہتا ہے جواباً ایک مصرع لکھا تھا "عشق و مزدوری عشرت گہ خسرو کیا خوب" سالہا سال بعد یہ مصرع اس وقت پھر دہرایا گیا جب فرمان صاحب نے نیاز نمبر میں شرکت کی دعوت دی نیاز نے ماضی میں وضاحت کر دی تھی

کہ میں کتاب میں اپنی تعریف نہیں لکھوانا چاہتا مقصود اصلی یہ ہے کہ آپ جتنی گالیاں مجھے دینے والے ہوں سب لکھ کر بھیج دیں تاکہ دوبارہ غم و غصہ کھانے سے بچ جائیں"۔ لیکن افسوس ہے کہ انہوں نے نہ خط کا جواب دیا نہ کوئی قصیدۂ سب و شتم لکھ کر بھیجا کہ میں اسے نوشتۂ آخرت سمجھ کر "من و یزداں" میں شامل کر دیتا۔

یقیناً یہ باتیں اکتا دینے والی تو نہیں ہیں آپ اگر بھول نہ گئے ہوں تو بات چلی تھی پہلی ملاقات سے جس کا حاصل یہ جملہ تھا۔ "میرا مقام بہت اونچا ہے مولویوں کی دسترس سے باہر رہتا ہوں"۔

یہ وہ دور تھا جب میں جنابِ رئیس احمد جعفری کے سایۂ عاطفت میں گویا پروان چڑھ رہا تھا والد صاحب کی استدعا پر مرحوم نے مجھے اپنی تحویل میں لے لیا تھا علم و ادب کی دنیا میں سانس لینے لگا ماہنامہ "ریاض" کا اجرا میرے سامنے کی بات ہے اس میں کبھی کبھار نیاز کے خطوط بھی چھپ جایا کرتے تھے گھر آنا ہوتا تو یہاں "ایک شاعر کا انجام" "شہاب کی سرگزشت" وغیرہ سے سابقہ پڑتا یا والد صاحب کے نام ذاتی مکاتیب نظر نواز ہوتے مختصر یک سطری بہت کم مختصر کی تہمت سے آزاد بات "من و یزداں" تک بھی پہونچی اور ہم کوشاں نگارشات نیاز کے رہنے لگے، یہاں تک کہ میں اپنی خود سری کے ہاتھوں تعلیم ادھوری چھوڑ کر گھر آ براجا، تھوڑے ہی دنوں میں اپنی بیکاری کھل گئی تلافیٔ مافات کے لئے رہنمائی نیاز سے چاہی جواب دوسری ڈاک سے آیا جس میں مجھے مولوی عبدالحق کے اردو کالج میں داخلہ کا مشورہ دیا گیا اور یہ اجازت بھی کہ براہ راست مولوی صاحب کو میرے حوالہ سے لکھ دیں میں نے حوالہ دیئے بغیر لکھ مارا حاشیہ نشینی تو نہیں مراسلت کی سعادت ضرور حاصل ہو گئی۔

نیاز سے پہلے نگار "مشرف بہ اسلام" ہوا یعنی پاکستان منتقل ہوا یہ دور بھی عجیب رہا تاہم داد دینا پڑتی ہے کہ سلسلہ اشاعت میں کوئی جھول نہیں پڑا وہ تو ۱۹۵۱ء ہی میں ڈھاکہ کو منتخب کر چکے تھے شوکت سبزواری کو واسطہ بنا کر اس وقت کے ڈائرکٹر تعلیمات فضل احمد کریم فضلی کو پیغام بھجوایا کہ سر چھپانے کی جگہ مل جائے تو میں رخت سفر باندھوں مگر اس کو کیا کیجئے کہ شوکت صاحب کو عندلیب شادانی کی خاطر کچھ ایسی عزیز تھی کہ انہوں نے یہ پیغام فضلی صاحب تک پہونچایا ہی نہیں، کیا ہوا اگر اس کا بھگتان دس برس تک نیاز کو بھگتنا پڑا، رشک وحسد اور بغض معاویہ کی متعدد روایات شادانی صاحب سے منسوب ہیں اللہ نیک توفیق دے حالات کا جائزہ لینے کے لئے کراچی سے واپسی پر اگست ۱۹۶۱ء میں روہڑی سے گذرے، میں ایک قلبی واردات کے ہاتھوں دل وجگر کے ساتھ ساتھ دونوں پھیپھڑے بھی مفلوج لئے پڑا تھا دل مسوس کر رہ جانا پڑا ویرا ہوتا تو ممکن تھا مسافر اس ویرانے کی بہار بنتا، والد محترم مشہور سندھی شاعر اور ادیب شیخ محمد فاضل ایم اے کی معیت میں روہڑی گئے اور اپنی محبت کا نقش چھوڑ آئے جناب شیخ کے استفسار پر فرمایا: پاکستان میں صرف یہ بچہ رئیس امروہوی کچھ اچھا کہہ رہا ہے" بلاشبہ پاکستان کی منظوم تاریخ روزنامہ "جنگ" کراچی میں چھپنے والے قطعات سے مرتب ہوتی چلی جا رہی ہے۔

میں نے چھ مہینے فکس بستر بنے رہنے اور پلنگ کی پٹی سے لگے رہنے کے بعد قدم جب نیچے رکھا تو ذہنی کا تو کچھ نہیں کہہ سکتا جسمانی صحت پہلے سے بدرجہا بہتر تھی اور الحمدللہ اب تک ہے اس دوران میں نیاز صاحب "مسلمان" ہو چکے تھے مستقل رہائش کراچی کے مشہور محلہ کیا بستی ناظم آباد میں اختیار کر لی تھی نگار اسی آب وتاب

سے شائع ہونے لگا یہ ذکر بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ لکھنؤ چھوڑنے بھی نہ پائے تھے کہ رام پور سے نگار نامی ایک ماہنامے کا ڈول ڈال دیا گیا یہ "نقل مطابق اصل" تھا قدو قامت لکھائی چھپائی رنگ و روپ حتیٰ کہ نمبر شمار سال اشاعت مستقل عنوانات وغیرہ میں سرِمو کوئی فرق نہ تھا بیک نظر ہر صاحبِ ذوق دھوکا کھا جائے اس لئے یہاں نگار "نگار پاکستان" کہلایا والد صاحب کے نام ایک مکتوب میں نیاز کی اعلیٰ ظرفی ملاحظہ فرمایئے: "نگار رامپور میری نظر سے گذر چکا ہے عرشی کے بیٹے ہیں ہیں کیا کہہ سکتا ہوں اگر اس سے انہیں کچھ فائدہ پہنچ جائے تو مجھے خوشی ہوگی" جی ہاں "نگار" کے دور ثانی یا پاکستانی میں "باب المراسلہ والمناظرہ" کی رنگا رنگی بدستور قائم رہی یہ غلط ہے کہ وہ خود سوال قائم کرتے اور بحث و نظر کا دروازہ کھول دیتے میرے چند خطوں کا جواب نگار میں آیا دیگر احباب اور بزرگوں نے بھی اس بات کی تصدیق کی، باب الاستفسار کی افادیت بڑھی کم نہیں ہوئی "مطبوعات موصولہ" کے عنوان سے بعض معرکے کی تنقیدیں نظر نواز ہوتیں اور مولانا ابوالخیر مودودی کا یہ کہنا کچھ جی کو نہ لگا کہ "بحیثیت نقاد حد سے گذر جاتے تھے" اگر ایسا ہوتا تو محمود احمد عباسی کی "خلافت معاویہ و یزید" پر ایسا جاندار بے لاگ اور غیر جانب دارانہ تبصرہ کبھی قلم کی زبان نہ بنتا، البتہ ہمارے مولانا ماہر القادری نیاز نمبر پر تبصرہ کرتے ہوئے حد سے گذرے ہوں یا نہ ہوں آپے سے باہر ضرور ہو گئے تھے۔

یہ نگار و نیاز ہی کا مقام تھا کہ اقبال اور ابو الکلام کی حیات معاشقہ کے متجسس رہے، اقبال تو شعری احتساب سے بھی نہ بچ سکے اس کے علاوہ ہر صنف ادب پر نگار میں آپ کو بہترین مواد مل سکتا ہے فارسی غزلیات کی اشاعت کا اہتمام محض لوگوں میں ذوق پیدا کرنے کی تحریک تھی، سالنامے بھی حسب معمول

چھپتے رہے اور مشرقی روایات کے خلاف ایک سالنامہ نیاز نمبر کی سرخی لئے ہوئے آیا۔ نگار کی چالیس سالہ خدمت کا صلہ کہہ لیجئے اس نمبر کی اشاعت کے دو ہی چار ہفتے بعد ڈاکٹر فرمان فتحپوری سے ایک ملاقات ہیں میں نے اظہار ناپسندیدگی کردیا وہ چپ کئے اور خالی خالی نظروں سے میرے چہرے پر آثار حماقت تلاش کرتے رہے مگر یہ واقعہ ہے کہ سوا چھ سو صفحات میں نیاز کے فلسفۂ ادب اور تھوڑی بہت بچگانی مذہبی مسلک پر بھی ہیں اور کہیں وہ افسانہ نگار شاعر نقاد کی حیثیت سے پرکھے گئے ہیں تو کہیں فلسفہ صحافت اور مذہب کی کسوٹی پر چڑھائے گئے ہیں ذاتی حالات کا اجمالی ذکر آیا بھی تو صرف نیاز کے اپنے مضمون میں چاہئے یہ تھا کہ خود نوشت سوانح کے ذیل میں نیاز سے زبردستی دو تین سو صفحہ کا مسالہ فراہم کرایا جاتا فضا" صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے" کی آئینہ دار ہوتی تو بہتوں کو تکلف اور رلئے دیئے ہوئے انداز میں قلم نہ اٹھانا پڑتا۔ شخصیت کے تمام پردے اور نقاب ایک ایک کرکے اٹھ جاتے مگر یہاں تو صورتحال یہ بھی کہ طفیل صاحب نے ہمت کرکے دو چار سطریں لگی لپٹی رکھے بغیر لکھ ڈالیں پورا مضمون قطع و برید کے جاں گسل مراحل سے گذر کر نگار میں آیا اب ہر ایک کے پاس ذاتی پریس اور پرچے کہاں ہیں کہ طفیل صاحب کی تقلید میں اصل مضمون بے کم و کاست اپنے پرچے میں چھاپ کر رسوا کردے، شاہد احمد دہلوی سے غالباً اس لئے نہیں لکھوایا گیا کہ وہ جوش پر ایک پیارا سا مضمون لکھنے کی پاداش میں نکو بن کر رہ گئے تھے اور اپنی تصنیف لطیف "گنجینۂ گوہر" میں نیاز کو لتاڑ چکے تھے شاہد مرحوم نیاز کی ناقدانہ بصیرت کے زبان سے تو نہیں دل سے معترف نہ ہوتے تو ساقی کے جوش نمبر میں نیاز کے ایک چھوڑ دو مضمون کیونکر نقل ہوتے۔

اردو ادب کیوں یاد نیازئے علم وادب میں نگار ایک ایسا مثالی پرچہ ہے جس کا دامن اپنے مدیر کے افکار عالیہ سے مالا مال رہا ہے اور اسے مضمون نگاروں کے ناز وادا اور جور و جفا کا شکار نہیں ہونا پڑا نیاز مدیر اس پایہ کے تھے کہ پورا رسالہ اپنے طبع زاد مضامین سے بھر دیتے تھے اور اس میں موضوع کی کوئی قید نہ تھی کوئی موضوع ایسا نہ تھا جس پر مرحوم نے نہ لکھا ہو، مالک ناشر دفتری چپراسی معتمد غرض بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا سب کام اپنے ہاتھ سے کر کے وہ اپنی ذات سے اک انجمن ثابت ہوئے۔

لکھنؤ چھوڑنے کا سرسری ذکر بھی نیاز نے بڑے دکھ اور بے بسی سے کیا ہے کھل کر نہیں لکھ سکے دوسروں نے بھی اسے سینے کا راز بنا لیا اور صرف یہ لکھ کر رہ گئے کہ لکھنؤ سے ہجرت کا مجھے علم ہے" غالباً شادمانی کے راہیں مسدود کر دینے کے بعد وہ لکھنؤ پر مطمئن ہو چکے تھے اور پاؤں توڑ کر بیٹھ بھی گئے خدا جانے وہ کیا اسباب تھے کہ باوجود تمام اعزاز واکرام سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور پاکستان آکر دم لیا، ناک بھوں یہاں بھی چڑھائی گئی اور ہر مجلس و محفل کا موضوع بنے رہے جناب رئیس امروہوی تو یہاں تک کہہ گزرے۔" یہ انہوں نے ہندوستان سے غداری کی ہے ہر قسم کے اعزاز لے کر بھاگ کھڑے ہوئے" بات کچھ آگے بڑھی تو فرمایا۔" پہلے مجھے بھی ہنگاموں سے عشق تھا اب وحشت ہوتی ہے دس برس تک روزانہ باقاعدگی سے شراب پیتا رہا اب وہ لذت نصیب نہیں ہوتی یہ سرمستی اور بدمستی کی منزلیں طے ہو چکیں اب کچھ کر گزرنے کا وقت ہے لیکن میں نے دیکھا نیاز صاحب یہاں آئے لیکن وہ بھی ابھی تک انہی چکروں میں پڑے ہوئے ہیں عورت کے پجاری ہیں۔ اور الحاد مرض کی سی صورت اختیار کر چکا ہے حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے زندگی کو

ریٹائیر نہیں کیا مجھے اس قدر یاروں نے بدنام کر رکھا ہے کہ نیاز صاحب تک پوچھ بیٹھے آجکل کس کس سے "تعلق خاطر" ہے وغیرہ" ضیاء الدین احمد برنی شاکی تھے کہ وہ کلام الٰہی کو کلام الٰہی کہاں تسلیم کرتے ہیں مجھے نیاز کا دہریہ پن بھی پسند نہیں"۔ البتہ نیاز کی وضعداری کے معترف اور شام کی ہواخوری کے گواہ تھے اپنے تعارف اور تعلق کی عمر ۱۹۰۸ء سے شمار کرتے تھے حیرت شملوی خوش تھے کہ نیاز کا یہ نیاز مند بھی چودہ سالہ۔ جدوجہد کے بعد پاکستانی ہے غلام نہیں آزاد، اطلاع پاتے ہی طبع پرسی کے لئے بنفس نفیس ناظم آباد سے کلفٹن تشریف لائے اور اپنی بے پناہ شوخی اور چلبلاہٹ سے موہ لیا جتنے منہ اتنی باتیں، ایسا بھی کوئی ہے سب اچھا کہیں جسے، ۶۶ء کی ایک دوپہر کو جوش ملیح آبادی کی زبانی بھی جو کچھ سنا وہ یہ تھا کہ ہوش بلگرامی اور نیاز کو کھانے پر بلایا جوش کے ایک عزیز ابرار حسن خاں پی کر بہکتے اور گالیاں بکتے بوچھاڑ نیاز و ہوش پر بھی پڑی غلط فہمی یہ پیدا ہوئی کہ یہ سب میزبان کے ایما سے ہوا ہے دلوں میں کدورت آگئی اور وہ ایک مدت تک رہی یہ واقعہ سن کر میں اس سوچ میں پڑ گیا کیا صرف جوش اور ابرار حسن نے شغل فرمایا ہوگا بدگمانی یہ رہی کہ حضرت نیاز اور ہوش نے بھی شیشے کی پری کو دل کے آئینے میں ضرور اتارا ہوگا اس کی تصدیق یا تردید کیونکر ہوتی جب کہ نیاز کی مے نوشی کا چرچا کبھی عام ہوا ہی نہیں یہ راز اس وقت افشا ہوا جب میں مرحوم نے حضرت کو کھانے پر مدعو کیا اور پوچھا کیا پئیں گے آپ، جواب ملا "جن"

"جن" نامی ماہنامے کا اجرا اُس دور میں عجیب سی بات تھی اس سے مرحوم کی انفرادیت جدت پسندی اور تنوع مزاج کا پتا چلتا ہے "جن" نے عمر صرف ایک برس کی پائی۔ مجھ سے فرمائش کی گئی تھی کہ اس کا انتخاب کر لو بلکہ مجھے بھیج دو میں خود کر دوں گا،

تم چھپوا دینا اب بھلا کون عقل کا اندھا والد صاحب کے عاریتاً پیش کئے گئے قلمی نسخے کے زبان کو دیکھتے ہوئے بھی نیاز اور مولوی عبدالحق جیسے بزرگوں کے جال میں پھنس کر خون پسینہ ایک کر کے جمع کئے گئے نوادرات سے ہاتھ دھو بیٹھنے کے لئے تیار ہوگا۔

کراچی جاتے ہوئے جہاں مشاہیر عصر سے شرف نیاز حاصل کرنے کے منصوبے بنا لئے تھے وہاں نیاز صاحب کی دید کا اشتیاق بھی روز افزوں تھا تاکید والد صاحب نے بھی کردی اور از قسم "سوغات" چند چیزیں ساتھ کردیں مثلاً خالص گھی کہ کراچی میں چیل کا موت تو مل سکتا ہے گھی نہیں، کراچی کا پانی تک صاف نہیں تو گھی کیا خاک ہوگا اور اب تو بہت کم لوگ وہاں کے ایسے ہیں جن پر صاحب اخلاص کی "پھبتی" صادق آئے گی جناب عارف نیازی کو دفتر نگار واقع گاندھی گارڈن سے ساتھ لے کر جب میں دل ہی دل میں سر کے بل ناظم آباد چلا ہوں خون کی گردش میں زیادہ نہ سہی کچھ نہ کچھ تیزی ضرور آچکی تھی سوچ رہا تھا اس آفت جاں سے سامنا کیونکر ہوگا قوت گویائی سلب ہو کر نہ رہ جائے میری اوقات ایک قطرے سے بڑھ کر نہ تھی جسے سمندر میں ٹپکایا جانے والا تھا خدشہ فنا نے اور مضطرب کیا مجھے حیرت ہوئی میری ہستی ناپائیدار ثابت نہ ہوئی مرحوم چشمے کی اتھاہ گہرائیوں اور موٹے موٹے تالوں سے چور نظروں سے دیکھ لیتے تھے چہرہ بڑھاپے کی وجہ سے لٹک گیا تھا کم گوئی نے اور سنجیدہ اور بارعب بنا دیا تھا تھوڑی بہت ہیبت بھی ٹپکتی تھی مگر جب بولتے تو یہ دبیز نقاب خود بخود الٹ جاتی آواز کراری لہجے میں لگاوٹ تو نہیں لاگ ضرور تھی مٹھاس بھی کہئے تو برا کیا ہے بڑی محبت اور تپاک سے ملے، میرا حوصلہ قائم رہا کچھ بڑھا اور میں نے جدید شاعری کا ذکر ان کی رائے معلوم کرنے کے لئے چھیڑا، فرمایا۔

آج کل جو کچھ جدید شاعری میں پیش کیا جارہا ہے وہ حرف الفاظ کا چکر ہے بس وزن قائم رکھتے ہیں کوئی پیغام نہیں ہوتا چینی اور جاپانی شاعری کہنا چاہئے چھوٹے چھوٹے نثری ٹکڑے ہیں لیکن ان میں ایک پیغام ہوتا ہے دل سے نکلی ہوئی باتیں ہوتی ہیں۔ تلقین عمل ہے اس میں ردلیف قافیہ تو رہا الگ وزن کی بھی پابندی نہیں لیکن شاعری اعلیٰ پایہ کی ہے جدید شاعری محض الفاظ کی شعبدہ بازی ہے اور سب سے بڑا شعبدہ باز جوش ہے اس کی شاعری زندہ رہنے والی نہیں الفاظ کے ڈھیر لگا دیئے ہیں بات دل سے نکلی ہوئی نہیں دماغ ہی دماغ ہے، اقبال! اس کے دل سے بات نکلتی تھی اور اسکی زبان بن جاتی تھی جوش کے یہاں یہ تو نہیں کہ روح نہیں ہے، ہے لیکن خفیف" یہ رائے کم وبیش نیاز ہی کے الفاظ میں یہاں نقل ہوئی ہے، ہاتھوں میں رعشہ تھا، رہائش دوسری منزل پر تھی مطالعے کی میز گیلری میں رکھی ہوئی تھی۔

٭جس پر برہم ناتھ دت کی تصویر سے زیادہ داڑھی بہار دکھا رہی تھی، گیلری کے بیرونی حصہ پر" ادارہ ادب عالیہ" کا بورڈ بھی لٹکایا گیا تھا، اپنے بھتیجے محمد شاہ اور ولی عہد ابوالکلام کے علاوہ مانگے تانگے کا ایک کیمرہ بھی ساتھ لے گیا تھا تصاویر میں بیگم صاحب نیاز نے بھی شرکت فرمائی یہ باتیں ۲۶ر جولائی ۶۳ء کی یادگار ہیں

اسی پھیرے میں ۲ر اگست کی سہ پہر کو میں والدہ ماجدہ بھابی اور بہنوں کے ساتھ جانے پر نیاز صاحب کے ہاں مدعو تھا ساقی کے جوش نمبر کو شاہد صاحب کی لغو اور مہمل کوشش قرار دیا میں لے محمد آباد تشریف آوری کی طرح ڈالی وعدہ تو کر لیا تھا ایفائے عہد کی نوبت غالباً اس لیئے نہ آسکی کہ پاکستان باسی ہوتے ہی نیشنل میوزیم میں مخطوطات کی ترتیب وتدوین پر مامور کر دیئے گئے ترقی اردو بورڈ میں بھی عمل دخل کا موقعہ مل گیا تھا فرمان

صاحب کار کہنا یہ تھا کہ بورڈ کے ممبران محض تنخواہیں وصول کرتے ہیں نیاز صاحب اب جانے لگے ہیں کامی آدمی ہیں سب ان سے گھبرائیں گے۔

پاکستان میں ایک اخبار کم از کم ایسا ہے جس میں کیا چھوٹے کیا بڑے سبھی لکھنے والوں نے نظم و نثر میں اپنے جوہر دکھائے ہیں نیاز بھی ہاتھوں ہاتھ لیے گئے اور ہم نے انقلاب چرخ گرداں یوں بھی دیکھا ہے کہ ایک طرف علم و فکر کے عنوان سے جوش صاحب نثر لکھ رہے تھے تو دوسری طرف زنگار رنگ کے ذیل میں نیاز کی نظمیں آنے لگیں نثر پہ اترے تو مطبوعہ مضامین کی بھرمار کردی بہت کم نئی چیزیں قلم سے کاغذ آشنا ہوئیں کیا ہی اچھا ہوتا وہ اپنی زندگی کے اوراق الٹنے بیٹھ جاتے جبکہ یادداشت ایسی زبردست کہ چار برس کی عمر تک کی باتیں محفوظ، پوری ایک تاریخ اور بیش بہا خزینہ دامن اردو میں سمٹ آتا یہ مرض ہر عبقری میں پایا جاتا ہے اپنے حالات زندگی صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنے میں ہمیشہ بخل سے کام لیتا ہے۔ یہ روش مشرق کا طرۂ امتیاز ہے مغرب اس سے مستثنیٰ ہے، ابونواس پر حضرت کا مقالہ سید محمد تقی نے ناقابل اشاعت ٹھیرایا اس پر رئیس امروہوی صاحب نے ازراہ تفنن پوچھا تھا قبلہ کیا آپ بھی حور و غلماں کی للک باقی ہے مسکراتے ہوئے شوخی سے کہا کیوں نہیں! رئیس اس پر بھی باز نہیں آئے کہا اچھا تو پھر میں انتظام کردوں ہونٹوں سے کھا لیجیے گا، غالب کی مشکلات کو آسان کیا تو اس پر بھی لے دے ہوئی اور فیض احمد فیض، جوش ملیح آبادی، ابوالاثر حفیظ جالندھری کی طرح نیاز بھی عرصہ "جنگ" میں کام آئے، میر خلیل الرحمٰن تقی صاحب سے شکوہ سنج ہوئے: "نیاز کے مضامین ایک تو مطبوعہ چلے آرہے ہیں دوسرے اخباری نقطۂ نظر سے بھی جاندار نہیں ہوتے، خدا بھلا کرے تقی صاحب کا میر صاحب کو یہ باور کرانے

میں کامیاب ہو گئے: جنگ میں چھپنے والی بعض تصاویر پر سینکڑوں روپیہ اٹھ جاتا ہے اور نیاز کو تو ان کی ساٹھ سالہ ادبی خدمات کی پنشن ملتی ہے آپ کے اخبار سے ، میر صاحب کی اعلیٰ ظرفی اور نیاز نوازی کی داد دینا پڑتی ہے کہ پھر کبھی اس موضوع پر کسی سے گفتگو نہیں آئی اس بحث و نظر میں مضامین کی اشاعت کا سلسلہ منقطع ہو گیا سید محمد تقی راوی ہیں کہ ایک دن کیا دیکھتا ہوں حضرت دفتر جنگ کی تیسری منزل پر میرے پاس چلے آرہے ہیں میں حیران کہ اس عمر میں اتنی سیڑھیاں طے کر کے آنے کا سبب کیا ہے سخت پریشانی اور ندامت کے عالم میں عرض کیا حضرت آپ نے کیوں زحمت اٹھائی مجھے بلا لیتے یا فون پر حکم صادر فرمایا ہوتا ، کہنے لگے میاں یہ کیا بات ہے میرے مضمون دفتر جنگ میں تو آرہے ہیں اخبار جنگ میں چھپ نہیں رہے تقی صاحب نے آئندہ ایسا نہ ہونے کا یقین دلا کر اس مرد بزرگ کو با احترام رخصت کیا کراچی کی زندگی میں پیٹ پالنا بھی بڑے جان جوکھم کا کام ہے ۔

یہ تھیں وہ مصروفیات اور ہنگامے جو زنجیر بن گئے تھے اور وہ کراچی سے ایک قدم بھی باہر نہ نکال سکے یہاں کی آب و ہوا ، مشاغل کار شعری و ادبی مجالس نے ان کی صحت پر بھی خوشگوار اثر ڈالا بقول رئیس امروہوی ؎

رُخ پہ لالی چھا گئی چہرے پہ ماس آنے لگا
حضرتِ والا کو پاکستان راس آنے لگا

طفیل کے محمد نقوش[1] نے عائشہ خاں کا نام لیکر کوئی دور دار انکشاف نہیں کیا

---

[1] مدیر نقوش لاہور محمد طفیل صاحب کا نام مولوی عبدالحق نے انکی لگن اور نقوش کے بھاری بھر کم نمبروں کو دیکھ کر محمد نقوش رکھ دیا تھا نقوش اور طفیل اب درجہ بھی تو یک جان دو قالب رکھتے ہیں

یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں عورت تو نیاز کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی والد صاحب کے نام ایک خط کا ابتدائیہ ملاحظہ فرمایئے۔

میں اگر "کوئی پرست" ہوں تو صرف

"عورت پرست"

یا

"حقیقت پرست"

سروپ رانی پر مائل ہوئے تو نگار تخلص سے نگارہی میں چھپنے لگیں فضل حق قریشی نے طاہرہ دیوی شیرازی کا شوشہ چھوڑا تو بیچارے کلکتہ کی گلیوں میں جھانکتے پھرے نیاز نمبر میں "عہد رنگین کے یادگار مقامات" دس گیارہ گنوائے گئے ہیں غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ ان کا مقدر جو بے حد مشکوک ہے حسن کا مسل ہی رہا ہو۔

ستمبر ۶۳ء میں میں پھر جا دھمکا کواڑ نیاز صاحب نے بنفس نفیس کھولے، آہا آپ ہیں! مجھے کمرۂ استقبالیہ میں بٹھایا خیریت دریافت کی اور خود گیلری میں لکھنے چلے گئے صاحبزادگان قمر، سرفراز اور بیگم صاحب سے گفتگو ہی میں نے بھائی قمر کے ذریعہ ایک مضمون ملاحظہ کے لیے پیش کیا معلوم ہوا کہ اس وقت نہیں دیکھ سکتے کھانے کی میز پر ایک سے زیادہ قسم کی چیزیں تھیں حضرت نے بریانی کھائی گوشت کی خرابی کا ذکر کیا اور پانچوں انگلیاں چاٹ کر اٹھ کھڑے ہوئے مجھے تو اس سے گھن نہیں آئی مولوی عبدالحق یقیناً لال بھبوکا ہو کر اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے اور فرماتے لیجئے اس سے بھی شوق فرمایئے میں نے پوچھا آج کل کس موضوع پر لکھ رہے ہیں آپ؟ فرمایا "موضوع کیا ہے ایک تاریخ ہے اس کا ترجمہ کر رہا ہوں" میں نے دیکھا خراج

میں خشونت جگہ پا چکی ہے چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھلائے جا رہے تھے سب گھر والے
چوکنے نظر آئے کھانے کے بعد میں اعلام کرنے ان کے کمرے میں گیا تو لیٹے ہوئے
سوا کھا رہے تھے گھر میں لباس ململ کا کرتہ بنیان اور ململ ہی کا تہہ بند تھا گول
کمرے میں انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا کے علاوہ فارسی دواوین بھی سجے ہوئے تھے
ایام شباب کی تصاویر بھی آویزاں تھیں اور چند مصور شاہکار بھی (۲۲ ستمبر
۶۴ء کے پھیرے میں والد محترم کی ہمسفری کا لطف میسر آیا، جون کی گیارہ
تاریخ اور شام کا وقت تھا والد صاحب وجع المفاصل کے پرانے مریض، مرض
غالب تھا اس لئے سیڑھیاں طے کرنا تو کجا موٹر سے قدم نیچے رکھنے میں بھی بڑی
دشواری کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا، اس لئے خبر پاتے ہی فوراً بالکل جوانوں کی سی پھرتی
کے ساتھ نیچے اتر آئے کرسیاں بھی لگا دی گئیں اور ہم سب براج گئے باتیں غم جاناں
سے گردش دوراں تک پہنچیں کچھ بھول گئیں کچھ یاد رہیں، پنڈت نہرو کی بڑی
تعریفیں کرتے رہے: "بیچارے نے گھٹی گھٹی نوارت کی اور کر بھی کیا سکتے تھے
وزیر نہ ہوتے تو اچھا تھا وہ اس سے بلند تر تھے"۔ لغت نویسی کی بات چلی تو کہنے
لگے ترقی اردو بورڈ نے ایسے الفاظ بھی لے لئے ہیں جو متروک ہو چکے ہیں اب کام اتنا
بڑھ گیا ہے کہ سمیٹے نہیں سمٹتا صرف الف مکسورہ ہی پندرہ سو صفحے کا ہو گیا ہے
جو ابھی تک پریس نہیں گیا" میں بیچ میں بول پڑا، کیا موجودہ طریق کار کو بدلا نہیں
جا سکتا۔ "اب تو تکمیل ہی نہیں چھوڑتا وہاں کام کرنے والے صرف شوکت سبزواری
ہیں"۔ نیاز صاحب نے نسیم امروہوی کا نام نہیں لیا میں نے تو یہ دیکھا کہ پورے
کام کی نگرانی وہی کرتے نظر آئے آجکل شان الحق حقی مختار کل ہیں جوش تو

ٹھہرے جاہل کاہل نااہل، والد صاحب نے اپنی بیاض پیش کی چوکڑیاں بھرتے ہوئے اوپر گئے ایک مصرع لکھ لائے ——— فرحتم باد اکہ رولیش بامداداں دیدہ ام۔
ہمیں اپنے چچازاد بھائی سید صالح محمد شاہ کے استقبال کے لئے ہوائی اڈے جانا تھا حج کرکے آرہے تھے ولی عہد بہادر سرفراز نیازی کو بھی ساتھ لے لیا واپسی دس بجے رات کو ہوئی یہاں ہماری نحیف و نزار گاڑی تھک ہار کر دم لینے لگی نیاز صاحب نے اوپر بلا لیا کھانا کھلایا نیچا ترے ہوا کھاتے اور باتیں کرتے رہے ٹچپکا میں بھی نہ رہ سکا، حجر اسود سے بوس وکنار اور طواف کا مسئلہ پیش کر دیا فرمایا "بس رسم ہے ایک چلی آرہی ہے اسی طرح شیطان کو پتھر مارنا صفا، مروہ میں دوڑنا حضرت علی نے تم ایک خطبہ میں کہا بھی تھا کہ اگر اسلام ابتدائی دور میں نہ ہوتا تو میں بہت سی رسمیں بدل دیتا یا ختم کر دیتا۔ رئیس امروہوی کی زود گوئی کی تعریف کرتے رہے: ذرا سی توجہ کریں تو روزانہ قطعات کی خامیاں بھی جاتی رہیں"۔ میں نے کہا وہ تو فرائض منصبی کے تقاضے ہیں زور دے کر فرمایا "نہیں بس تھوڑی سی توجہ کی ضرورت ہے": یورپ اور عرب ممالک کا سفر اس لئے اختیار نہ کرسکے کہ روپے پیسے کی فراوانی کبھی نہیں رہی مگر مجھے اس سے یہ اختلاف ہے کہ وہ چاہتے تو جا بھی سکتے تھے، نگار کے لئے لمیٹڈ کمپنی کا مشورہ سنکر مایوسانہ گویا ہوئے۔ "بھئی میاں سب کو اپنی اپنی پڑی ہوئی ہے میں تو بے تعلق ہو کر رہ گیا ہوں۔" گاڑی کا مزاج کسی طرح درست ہوتا نظر نہ آتا دیکھ کر میں نے کھسکنے کی ٹھان لی آخر کہاں تک پیر مرد کو لب سڑک کھڑا رکھتے۔

بالکل غیر ارادی طور پر ایک دفعہ مرحوم سے نوک جھونک بھی ہو گئی۔

مولوی عبدالحق کا مذہبی مسلک " عنوان باندھا اٹکل پچو ادہر ادھر کی چند چیزیں جوڑ جاڑ کر اشاعت کے لئے منتخب نگار کو نہ جانے کس زعم میں کر بیٹھا اور براہ راست گھر کے پتا پر رجسٹرڈ بھجوایا پورا مضمون اس نوٹ کے ساتھ واپس آیا۔ "مضمون واپس کر رہا ہوں مولوی عبدالحق کے مذہبی مسلک پر اظہار خیال نہ مذہب کی خدمت ہے نہ ادب کی " جواباً ایک کارڈ لکھ کر رکھا ہی تھا کہ وہاں سے بھی ایک کارڈ صادر ہوا اقتباس ملاحظہ فرمائیے اسے چھوڑ دیئے کہ مرحوم کے بیشتر خط " اقتباسی " ہوا کرتے تھے شوکت تھانوی کی زبان میں تار نما خط ــــ آپ کا مضمون یوں تو بہت خوب تھا لیکن اس کی اشاعت ضروری نہ تھی " میں نے اس کے جواب میں بھی ایک کارڈ داغ دیا جواب " مفصل " آیا۔

"آپ کے دو کارڈ ملے آپ کی برہمی بے لطف آ گیا میں نے آپ کے مقالہ کی تعریف کی اس لئے کہ وہ اپنی زبان و اسلوب بیان کے لحاظ سے واقعی بہت خوب تھا لیکن اس کی اشاعت سے اس لئے معذرت چاہی کہ موضوع اس کا کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا مولوی عبدالحق کی مذہبیت پر گفتگو کرنا جبکہ انہیں کوئی مذہبی اہمیت حاصل نہ تھی بیکار سی بات ہے ایک خط میں آپ نے آزاد وغیرہ کے سلسلے میں بعض حضرات کے حیات معاشقہ کا بھی حوالہ دیا ہے سو اس کی حیثیت بالکل مختلف ہے چنانچہ دسمبر کے نگار میں ایک مضمون اسی نوعیت کا شائع بھی ہو رہا ہے آپ دیکھیں گے کہ میں نے اپنے نوٹ میں کیا لکھا ہے بہرحال آپ اگر اجازت دیں تو آپ

کے خطوط شائع کردوں اور ساتھ ہی اپنا جواب بھی"۔

اب میں پریشان یا الٰہی خیر غصہ کی تو نہیں احساسِ شکست کی جھانجھ میں نہ جانے کیا کیا کچھ لکھ ڈالا ہوگا جی کڑا کر کے اشاعت کی" اجازت مرحمت فرما ہی دی" دسمبر ۶۴ء کے شمارے نے بڑی راہ دکھائی کھول کر جو دیکھا تو صفحہ ۶۷ پر "مولوی عبدالحق کا مذہبی مسلک کے بجائے" مولوی عبدالحق کا مذہب" رقم تھا" اور اس کے بعد یہ تفصیل ۔

"یہ تھا عنوان ایک مقالہ کا جسے سید انیس شاہ صاحب جیلانی (محمد آباد ضلع رحیم یار خان) نے اشاعت کے لئے مجھے بھیجا تھا میں نے اسے پڑھ کر اس نوٹ کے ساتھ واپس کر دیا کہ "مضمون خوب ہے لیکن اس کی اشاعت نہ کوئی مذہبی خدمت ہوگی نہ ادبی" میری یہ بات "انیس شاہ" کو پسند نہیں آئی اور انہوں نے تابڑ توڑ دو خط مجھے لکھے پہلے خط کے الفاظ یہ ہیں ۔

"خلاف توقع تو نہیں تاہم میرا مضمون کل مجھے واپس مل گیا آپ فرماتے ہیں "مولوی عبدالحق کے مذہبی مسلک پر اظہار خیال نہ مذہب کی خدمت ہے نہ ادب کی" گستاخی معاف کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اقبال کی حیات معاشقہ کو منظر عام پر لانا ابوالکلام کی وارداتِ عشق کی کرید اور دریابادی کی عیش

کوشی کے واقعات "نگار" میں شائع کر کے
کس مذہب اور کون سے ادب کی خدمت
کی گئی ہے افسوس آپ نے میرے مضمون کا
ابتدائی حصہ غور سے نہیں دیکھا میں نے رونا
اسی بات کا رویا تھا اگر میں آپ کی بات
مان لوں تو اردو اور انگریزی ادب کی تمام
سوانح عمریوں کو نذر آتش کر دینا پڑے گا
چونکہ ہر کتاب میں موضوع کے مذہبی مسلک
پر بھی جی کھول کر گفتگو کی گئی ہے اگر آپ
صاف صاف یہ لکھ دیتے کہ پرستارانِ عبدالحق
کی یورش سے گھبراتا ہوں تو کچھ بات بھی
بنتی آپ سے اس کم ہمتی کی توقع ہرگز نہ
تھی مجھے اب بھی آپ سے کوئی شکایت
نہیں اور نہ ہی میری عقیدت اور محبت
میں فرق آیا ہے یقیناً یہ چند سطریں میری
برہمی کی غماز نہیں۔"

اور دوسرے خط کے یہ :-

مضمون کی واپسی کی رسید ارسال کر چکا
تھا کہ آپ کا کارڈ شرف صدور لایا میرا گمان

بالآخر غالب ہی رہا اب تک سنا یہی تھا اور
تجربہ بھی یہ ہے کہ آنجناب کی رائے بے لاگ
ہوا کرتی ہے اور لگی لپٹی نہیں رکھی جاتی۔
ایسے میں آپ کا یہ فرمانا کہ "یوں تو مضمون
بہت خوب تھا" محل نظر ہے، اگر یہ
تعریف بے جا ہے تو پھر آپ کی صاف گوئی
کو کیا ہوا اور اگر توصیف جائز ہے تو اسکی
اشاعت سے گریز کیوں؟ آپ یا تو یہ کہئے
کہ محض میرا دل رکھنے کے لئے آپ نے
مضمون کو "بہت خوب" سے نواز دیا یا پھر
اس کے لچر ہونے کا اعلان کر دیجئے"۔

ہر چند ان خطوط کا جواب خط ہی کے ذریعہ سے دیا جا سکتا تھا لیکن وہ شاید زیادہ مفصل نہ ہوتا اور انیس شاہ صاحب کی کوئی نہ کوئی شکایت پھر بھی رہ جاتی علاوہ اس کے بعض باتیں اس سلسلہ میں ایسی بھی آجاتی ہیں جن کا تعلق نفس مضمون نگاری سے ہے۔ اس لئے میں نے نگارہی کی وساطت سے جواب دینا مناسب سمجھا۔

میرا یہ کہنا کہ "مولوی عبدالحق کے مذہبی مسلک پر اظہار خیال نہ مذہب کی خدمت ہے نہ ادب کی"، اور اسکے جواب

میں آپ کا "اقبال کی حیات معاشقہ"۔ "ابوالکلام کی واردات عشق" اور "دریابادی کے واقعات عیش کوشی" کا ذکر کرتے ہوئے یہ فرمانا کہ یہ کونسی مذہبی یا ادبی خدمت تھی بڑی عجیب سی بات ہے۔

آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ مضمون نگاری کا اولین اصول یہ ہے کہ جو بات لکھی جائے اس کا کوئی نہ کوئی تعلق موضوع سے ضرور ہونا چاہئے اور اگر موضوع گفتگو کوئی خاص کردار ہے تو پھر ہم کو اس کی انہیں خصوصیات کو سامنے رکھکر گفتگو کرنا ہوگی جن سے وہ زیادہ جانے پہچانے جاتے ہیں اور اگر کوئی بات ان میں ایسی پائی جائے گی جو ان کے مسلمہ کرداری خصوصیات کی متناقض ہے تو اس پر بھی گفتگو کرنے کا حق ہم کو پہنچتا ہے اب آپ اس اصول کے پیش نظر خود اپنے اعتراضات پر غور کیجئے

(۱) اقبال شاعر تھے اور فلسفہ کے علاوہ حسن وعشق کے بھی شاعر تھے اس لئے اگر ان کی حیات معاشقہ پر اظہار خیال کیا جائے تو یہ قطعاً ادب کی خدمت ہوگی کیونکہ اس طرح ہم کو یہ سمجھنے کا موقع ملے گا کہ اقبال کے جذبات محبت کا (خواہ وہ آسودہ رہے ہوں یا ناآسودہ) ان کی شاعری پر کیا اثر پڑا۔

(۲) ابوالکلام کے واردات عشق کی جستجو یا اس پر اظہار خیال بھی بے محل بات نہیں کیونکہ وہ شاعر نہ ہوں تو بھی ان کی نثر کی شاعری اس بات کی غماز ہے۔ (اور خود انہوں نے بھی غبار خاطر میں اس کا صاف صاف اظہار کر دیا ہے) کہ وہ "کوچہ عشق" سے نابلد نہیں رہے اور اس بنا پر اگر ان کے واردات محبت کی جستجو کیجائے تو یہ بھی ادب کی خدمت ہوگی اور اگر انکی مذہبی اہمیت کو سامنے رکھا جائے تو یہ مذہب کی بھی خدمت ہوگی کیونکہ اس سے ثابت ہو سکے گا کہ مذہب اور محبت نہ صرف یہ کہ وہ ایک دوسرے کی ضد نہیں ہیں بلکہ یہ بھی کہ مذہب کی صحیح روح غالباً جذبہ عشق ہی سے پیدا ہو سکتی ہے

(۳) اسی طرح مولانا دریابادی کے ازدواج ثانی پر اگر نگار میں اظہار خیال کیا گیا تو اسے کیوں محل نظر سمجھا جائے" کیونکہ ان کی بڑھی ہوئی مذہبیت اور جذبات تقدس کو دیکھتے ہوئے ان کا نکاح کرنا نہیں بلکہ نکاح کے بعد مہینہ کے اندر ہی اندر طلاق دے دینا اور وہ بھی اس خاتون کو جو ان کے مرحوم دوست کی بیوہ تھی اور جس سے انہوں نے محض ازراہ شفقت و ہمدردی شادی کی تھی) بڑی عجیب سی بات تھی پھر اس کے بعد طلاق کی جو تاویل

انہوں نے پیش کی وہ خود ایک مذہبی مسئلہ بن گئی اور اس طرح اس پر گفتگو کرنا یقیناً مذہب کی خدمت تھی۔

اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ مولوی عبدالحق کے مذہبی مسلک پر گفتگو کرنے کی ضرورت آپ کو کیوں پیش آئی کیا انہوں نے کبھی مذہبی عالم و فقیہہ ہونے کا دعوی کیا تھا کیا وہ کوئی تحریر یا کتاب[1] اپنے بعد ایسی چھوڑ گئے ہیں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ انہیں مذہب سے بھی کوئی دلچسپی کبھی رہی تھی مولوی عبدالحق کے متعلق سب کو معلوم ہے کہ وہ مذہب سے قطعاً بیگانہ تھے اسلامی عقائد پر انہوں نے کبھی کچھ نہیں لکھا نہ انہوں نے تاریخ اسلام کا غائر مطالعہ کیا یہاں تک کہ بعض حضرات انہیں دہریہ و ملحد سمجھتے تھے حالانکہ سچ پوچھئے تو وہ غریب یہ بھی نہ تھے کیونکہ محض خدا اور مذہب سے بے تعلق رہنے کا نام الحاد نہیں ہے رہا اس سے انکار سو یہ اتنی بڑی بات ہے کہ انہیں کبھی اس کی جراءت ہی نہ ہو سکتی تھی۔

ان حالات میں آپ کا مولوی عبدالحق کے مذہبی مسلک پر کچھ لکھنا بالکل ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی مرید کے حالات میں یہ جستجو کرے کہ آیا وہ ستار بھی بجا سکتے تھے یا نہیں یا حالی کے متعلق یہ گفتگو کرے کہ انہیں رقص و سرود

---

[1] معترکہ مذہب و سائنس پر کا دیباچہ بجائے خود ایک کتاب ہے اس کے علاوہ بھی متعدد تحریروں اور تراجم سے مولوی صاحب کے معتقدات عیاں ہیں

میں کتنا ملکہ حاصل تھا۔

ہاں اگر آپ مولوی عبدالحق کی صرف ادبی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی اہمیت یا عدم اہمیت پر گفتگو کرتے تو بیشک یہ بات برمحل ہوتی آپ نے مثالاً اردو انگریزی کی سوانحی کتابوں کا بھی ذکر کیا ہے انمیں بیشک ہر قسم کی چھان بین ہوتی ہے لیکن آپ کا مضمون تو سوانح عبدالحق سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھتا محض ایک مختصر سا مقالہ ہے ہاں اگر ان کی مفصل سیرت پر آئندہ کوئی کتاب تصنیف کرنا مدنظر ہو تو اس میں بیشک آپ ان کے مذہبی خیالات پر بھی سرسری نظر ڈال سکتے ہیں۔

ایک بات اور رہ گئی وہ یہ کہ میں نے آپ کے مضمون کے متعلق لکھا کہ وہ خوب ہے سو یہ بات میں پھر کہوں گا کیونکہ جس حد تک زبان و بیان ادب و انشاء کا تعلق ہے وہ یقیناً نہ صرف خوب بلکہ بہت خوب ہے اور میں بہت خوش ہوتا اگر آپ اسی خوبی کے ساتھ کسی اور موضوع پر اظہار خیال فرماتے۔

آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ غالباً پرستاران عبدالحق کی یورش سے گھبرا کر میں نے آپ کا مضمون شائع نہیں کیا سو اس کے جواب میں بجز اس کے اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ

گفتہ بودی ہمہ زرقند و فریبند و فسوس

سعدی آں نیست ولیکن چو تو فرمائی ہست

آپ نے دیکھا نیاز صاحب کے تردیدی دلائل کے حرف حرف سے
پہلو تصدیق اور تائید کا نکلتا ہے چونکہ یہ "کارروائی" باب المراسلہ والمناظرہ
کے تحت عمل میں آئی تھی اس لئے میں نے جواب الجواب لکھنا ضروری سمجھا۔
رسید آئی "آپ نے بڑی عجیب بات لکھی کیا عبدالحق بھی اورنگ زیب ہی
کی طرح اپنے زہد و تقوی کے لئے مشہور رہے مومن کو کافر کہنا تو خیر ایک بات ہے
دلچسپ لیکن کافر کو کافر کہنے میں کیا لطف" افسوس میں نے اپنے طویل مراسلہ
کی نقل نہ رکھی اس کمی کو مولانا غلام رسول مہر کے ایک مکتوب سے پورا کرتا ہوں

"مولانا عبدالحق مرحوم کے متعلق آپ کا مقالہ نہ چھاپنے
کے سلسلے میں نیاز صاحب نے جو کچھ فرمایا ہے میرے
نزدیک تو چنداں محکم نہیں مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا
عبدالماجد دریابادی کے متعلق جو توجیہات نکال لی گئیں
وہ آپ کے مضمون کے بارے میں بھی نکالی جا سکتی ہیں مثلاً یہ کہ:

(۱) مولانا مدت العمر اردو کی خدمت میں مصروف رہے۔

(۲) انہوں نے سالہا سال تک اس زبان کے سلسلے میں
گاندھی جی کانگریس اور مخالفین سے جنگ جاری رکھی ۔

(۳) ان کے اس عزم و ہمت میں مذہبی جذبہ بھی کارفرما
تھا یا کہہ لیجئے کہ ایک محرک مذہب بھی تھا کیونکہ اردو کی

دوسری خصوصیات کے علاوہ ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ
دوسو سال سے مسلمانوں کے فکر و نظر کی بہترین دولت
اس زبان میں منتقل ہوتی رہی اور اس کے مٹائے جانے
سے جہاں نقصان کا ایک پہلو یہ تھا کہ ہندوستانی ثقافت
کی ایک مشترکہ ثروت ناپید ہوتی وہاں ایک بڑا نقصان یہ بھی
تھا کہ مسلمانوں کے ارباب فکر و نظر نے دو سو سال میں جو
کچھ پیدا کیا تھا وہ مٹ جاتا یا آئندہ نسلوں کیلئے ناقابل فہم بن جاتا
رہی خدمت ادب میں مولانا عبدالحق کے ایک زبردست
محرک کو نظر انداز کر دینا سراسر غیر مناسب تھا لہذا ان کی
دینی حیثیت پر بحث عین مناسب تھی:

۵۔ پھر مولانا بحمد اللہ مسلمان تھے اور ان پر مختلف لوگوں
نے دین سے بے تعلقی یا بے پروائی کے الزامات لگائے گویا
ایک جلیل الشان خدمت گذار ادب اردو کی سیرت میں سقم
کا پہلو پیدا کیا ضروری تھا کہ اس سقم کا ازالہ کر دیا جاتا
اور اس مضمون کی اشاعت بہر حال ضروری ہے پھر جب
مضمون اچھا ہے تو کیوں نہ چھاپا جائے‘‘۔

میں نے سقم کو لوگ کہتے ہیں غیر جانب دارانہ "ہوا" دی تھی ازالہ
کہاں ممکن ہے مولوی صاحب. مرحوم حد درجہ آزاد خیال واقع ہوئے تھے۔
بلکہ یہ کہنے میں زیادہ لطف ہے کہ پیدا ہوئے تھے۔

ہمت میں نے بھی نہیں ہاری "مولوی عبدالحق دیدہ وشنیدہ" کے عنوان سے ایک اور مضمون ارسال کر دیا، جسے ان کو چھاپتے ہی بنی، یک سطری کارڈ۔ مضمون مل گیا جنوری (۱۹۶۵) کے نگار میں شائع ہوگا۔" میں نے اس پر بھی تاکیداً لکھا کاٹ چھانٹ قطعاً نہ کی جائے فرمایا: "آپ کے مضمون میں کوئی تغیر و تبدل نہیں کیا گیا سوا اس کے کہ عبارت میں اگر کہیں جھول تھا تو اسے دور کر دیا گیا ہے۔" اور وہ " جھول" معلوم ہے آپ کو کہاں کہاں تھا جہاں تعریفی کلمات زبانِ قلم سے بے اختیار ٹپک پڑے تھے حذف کر دیئے گئے یہاں یہ بتانا بھی خالی از علت یا دلچسپی نہ ہوگا کہ اسی مضمون کو "لیل ونہار" اردو ڈائجسٹ "" سیارہ ڈائجسٹ" "عالمی ڈائجسٹ" "ماہ نو" ناقابل اشاعت گردان چکے تھے "اردو ڈائجسٹ" کے عملے نے تو حسن کارکردگی کی انتہا کر دی میں نے از راہ حماقت مولوی عبدالحق کی دو قلمی تحریریں بھی نتھی کر کے بھیج دیں، تاکہ ان کے عکس بھی چھپ جائیں اور لوگ مولوی صاحب کی پاکیزگی تحریر سے محظوظ ہوں یہ دونوں تحریریں سال چھ مہینے کے شدید تقاضوں کے بعد مضمون جب مجھے واپس ملا تو غائب تھیں اس پر صبر نہ کرتا تو کیا کرتا "ماہ نو" کے ظفر قریشی میرے پرانے کرم فرما ہیں انھوں نے حقِ بزرگی اس طرح ادا کیا کہ پورا مضمون اپنے الفاظ میں لکھ کر میرے نام بغرض " منظوری" ارسال فرمایا بیچاروں نے بڑی مشقت اٹھائی ظاہر ہے مجھے معاوضہ بھی ملتا اور "نام" بھی ہو جاتا مگر میں نے بصد ادب معذرت چاہ لی اور مضمون کی واپسی پر اللہ اور ظفر صاحب کا شکر ادا کیا یہ مضمون نگار سے شورش کاشمیری کے چٹان میں بھی نقل ہوا، داد دلی تک سے

ملی اس طولِ تحریر کا مقصود اصلی خودستائی نہیں صرف یہ جتلانا ہے کہ —— لکھنا سہل اور چھپنا دشوار تر ہے۔

ایک بار آپا دھاپی میں کراچی جانا ہوا صرف دفتر نگار میں جھانک کر چلا آیا بزرگانہ شفقت ملاحظہ فرمایئے لکھتے ہیں۔ "آپ نے بھی کمال کیا کہ کراچی آئے دفتر نگار گئے اور مجھے خبر تک نہ کی دفتر نگار سے فون ہی کر لیا ہوتا۔" آج یہ باتیں روح کا پیکان بنکر رہ گئی ہیں نجانے کس ترنگ میں گیا اور چلا آیا۔

ایک مثال اور: "عزیزی انیس صرف ایک دن مجھ سے ملنے آئے تھے اس کے بعد سے غائب ہیں غالب" کراچی کی دلچسپیوں نے ان کا دامن نہیں چھوڑا۔" یہ شکایت والد صاحب سے کی گئی تھی مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا لفافہ میں ٹکٹ رکھ کر بھیجئے اس نوٹ کے ساتھ واپس آ جاتے: "یہ نہ کیا کیجئے مجھے تکلیف ہوتی ہے" مبارک اردو لائبریری کے لئے دو دو بوریاں کتب و رسائل کی بجھوا دیتے میرے سامنے بھی ایک مینار کھڑا کر دیا جاتا اور میں اپنے "مطلب کی چیزیں" چھانٹ کر چلا آتا، لائبریری کے لیے ربڑ کی مُہروں کی ضرورت پڑی مہروں کے ساتھ بلاک بھی پارسل میں آئے، کراچی آنے کے بعد تو وہ خط بھی خاصے لمبے چوڑے لکھنے لگے تھے اُدھر ابوالخیر مودودی کو یہ لکھنے کی ضرورت خدا جانے کیوں پیش آئی: "وہ جو چند بے ہودہ سے اعتبارات ہیں مثلاً مروت ایثار دوست نوازی وغیرہ نیاز صاحب ان لغویات کے بس اسی حد تک قائل ہیں کہ ان سے ان کو کوئی نقصان نہ پہنچے" (نقوش شخصیات نمبر ۵۳۱)

نیاز مرحوم نے روپے کی ڈھول کبھی نہیں اڑائی تنگ دست بھی نہیں رہے دور اندیش معاملہ فہم اور کاروباری/ بھی تھے کراچی میں دو منزلہ ذاتی
حد تک کاروباری
مکان تقریباً چالیس ہزار روپے میں خرید لیا تھا جو عابد منزل سے بدل کر اب نیاز منزل کہلاتا ہے یہ بھی کسی نے لکھا ہے ایک زمانہ میں فلمی کاروبار بھی شروع کیا تھا مگر اس میں چل نہیں سکے البتہ فلمیں دیکھنا نہیں چھوڑیں اور وہ بھی زیادہ تر انگریزی، ذاتی توہین بہت کم برداشت کرتے عدالتی کاروائی بھی کر گزرتے، مدرس بھی اچھے تھے حکیم اجمل خان کے انگلش اسکول کی ہیڈ ماسٹری کے لئے مولانا ابوالکلام آزاد نے انہی کو منتخب کیا تھا۔

میں جب آخری بار (۱۲ ستمبر ۶۵ء) ان سے ملا ہوں (دیکھ ایک روز پہلے چکا تھا جناح ہسپتال جا رہے تھے ٹیکسی میں) تو بظاہر تندرست دکھائی دیئے مطالعہ کے کمرے میں سے چل کر کمرہ استقبالیہ میں آئے اور آگے بڑھ کر مجھے پہلی اور آخری بار گلے سے لگا لیا ان کی نگاہوں میں مظلومیت اور محبت کی ملی جلی کیفیت دل کے پار ہوئی جاتی تھی کسی قدر کھوئے کھوئے سے گم سم چپ چپ بولتے وہ یوں بھی کم تھے بجز خلوتیاں راز کے رعشہ بڑھا ہوا تھا کینسر کے زخم کی وجہ سے مونچھیں بڑھ گئی تھیں اور بھلی لگتی تھیں کیمرہ ہوتا تو اس وقت کی تصویر یادگار رہی نہیں نادر روزگار ہوتی ہماری موجودگی میں ان کے ایک عزیز ڈاکٹر تھے یا شاید وکیل آ گئے اور پاک بھارت جنگ پر کچھ باتیں گوش گذار کرتے رہے جنہیں مرحوم نے بڑی توجہ سے سنا خود کوئی تبصرہ نہیں فرمایا۔

میں تنہا نہیں تھا شیخ محمد صادق اور اقبال ہاشمی سعادت دید میں شریک تھے اپنے ساتھیوں کا تعارف میں نے یہ کہہ کر کرایا کہ یہ لوگ آپ کے چاہنے والوں میں سے ہیں کہیں کہیں آپ سے نظریاتی اختلاف بھی رکھتے ہیں ٹکر ٹکر دیکھتے رہے بولے کچھ نہیں برادر عزیز سرفراز نے ٹیپ ریکارڈر کا ذکر کیا اتفاق سے اس وقت میرے پاس ایک فیتہ ایسا تھا جس میں حیرت شملوی مرحوم کی آواز مقید ہے جی چاہا کہ حیرت کی آواز نیاز صاحب کو سنوادوں، سرفراز نے ٹیپ ریکارڈر لاکر رکھا " سوچ آن " کیا گیا پتہ چلا اسکی ساخت کچھ اور ہے اور یہ فیتہ یہاں کام نہ دے گا اس تمام کارروائی کو نیاز خاموشی سے دیکھتے رہے **معترض نہیں ہوئے** میں نے سرگوشیوں میں سرفراز سے پوچھا اپنے ابا کی آواز بھی ٹیپ کرلی یا نہیں بولے اس کی اجازت نہیں تم کہو تو شاید مان جائیں مگر ہمت میری بھی نہ پڑی اور بات رہ گئی اقبال ہاشمی مصر تھے کہ میری بیاض نیاز کی قلمی تحریر سے خالی رہ گئی تو تا زیست خلش رہے گی ناچار اس شوق فضول کے پیش نظر جرات رندانہ سے کام لینا پڑا، اور یہ کہہ کر میں نے بیاض آگے بڑھادی آپ کا تصور خدا کیا ہے، ممکن ہے یہ ان کی آخری تحریر ہو جو ایک عقیدت مند کی بیاض میں نقل ہوئی ہے آیئے خدا کی باتیں آپ بھی سن لیجئے۔

"خدا کا تصور اور خدا کا وجود دونوں ایک دوسرے سے مختلف باتیں ہیں یہاں تک کہ خود انسان نے جو تصور خدا کا قائم کیا ہے وہ بجائے خود ثبوت ہے اس امر کا کہ وہ

حقیقت خداوندی سے بے خبر ہے۔

چوں ندیدیم حقیقت رہ افسانہ زدیم

$\frac{12}{9}$ ۶۵ نیاز فتحپوری

اس کے بعد وہ آٹھ مہینے زندہ رہے زندہ کیا رہے مرمر کے جیتے رہے وہ جو ہوا کے زور سے درخت کی ٹہنی سمیت کنوئیں میں جا ٹکا اور نکل آیا بھنور میں ڈوبتی ہوئی کشتی سے چھلانگ لگا کر کنارے آ لگا، سوتے میں آگ کی لپیٹ میں آ کر بچ نکلا، دلدل میں پھنس کر گھوڑے کی تو نہیں اپنی جان بچا لایا، دو قدم پر بیٹھے ہوئے شیر کو اپنی موجودگی کے احساس سے بے خبر رکھ لینا ڈاکوؤں کے نرغے میں گھر کر سلامت رہنا ریلوں کی ٹکر میں خراش تک نہ آنا کراچی کے موٹر رکشا بالفاظ دیگر "موت کے گولے" پر سفر کرنا اور معمولی زخم کھانا مولویوں کی دسترس سے باہر رہنا اور آخر کار ایک پھنسی سے زیر ہونا تعجب خیز ہے مگر جو چیز نیاز جیسی بھاری بھرکم ہستی پر غالب آ جائے اس کی بلاخیزی میں شک ہی کیا رہ جاتا ہے سرطان کا علاج دلی کے ایک ایسے حکیم کے سینے میں دفن ہوا جس نے محلہ بھر کے کہنے سننے اور خوشامد کے باوجود حکیم اجمل خاں کو خالی ہاتھ واپس کر دیا۔ جناح ہسپتال اور زمانہ بھر میں دردِ دل اور زخم جگر کا علاج تو ممکن ہے مگر اس موذی سرطان کا کوئی توڑ نہیں، مرض کبھی بڑھا کبھی گھٹا ء مجموعی طور پر یہ کہنا بجا ہوگا مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی، ہسپتال جاتے جاتے بھی بیوی بچوں کے لئے لون تیل لکڑی کی فکر کا سن کر جوش نے کیا خوب کہا تھا۔ "اور اس قوم میں پیدا ہو" سید محمد تقی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں

(صدر میں نگار کا نام و پتہ انگریزی میں چھپا ہوا ہے جس میں ٹیلیفون نمبر اور نیاز کے بجائے عابد منزل چھپ جانے سے نیاز مرحوم کو اپنے قلم سے یہ دونوں غلطیاں ٹھیک کرنا پڑیں۔)

اس خط کو محفوظ رکھیئے [ا] — (اشد ضروری) [ا]

DATE — ۱۱ — ۱۹

جناب سید محمد تقی صاحب ایڈیٹر جنگ

صدیقی الاعز، آپ کو معلوم ہو گا کہ میں کینسر میں مبتلا ہوں ریڈیو تھراپی سے فائدہ ضرور ہوا لیکن ازالۂ مرض نہ ہو سکا اب صورت صرف آپریشن کی رہ گئی ہے سو اس کے لئے میں جناح ہسپتال میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا ہوں۔

اس وقت تک میں جنگ کے لئے جو کچھ لکھ کر بھیج چکا ہوں اور اسکی اشاعت کی نوبت نہیں آئی چار مضمون ہیں۔

(۱) تاریخ رومہ کا ایک خونین ورق

(۲) بھارت کی بدعہدیاں معاہدہ حدیبیہ کی روشنی میں۔

(۳) محمود اور سومنات۔

(۴) جہاد اور ارشادات نبوی۔

آج مزید پانچ مقالے (رنگا رنگ) کے لئے بھیج رہا ہوں۔

(۱) دلچسپ معلومات (۲) حاتم طائی (۳) جادو ٹونا وغیرہ کا تاریخی پس منظر (۴) دمدار ستارے (۵) مدعیان نبوت کے کارنامے

[ا] سرخ بال پوائنٹ پنسل سے (انیس)

اسطرح کل آٹھ[1] مقالے آپ کے پاس موجود ہیں جو آخیر
نومبر تک کے لئے یقیناً کافی ہوں گے ـــ بہرحال یہ بضاعتِ
حقیر حاضر ہے اس سے کام لیجئے یا نہ لیجئے میں تو اب چلا اگر
اتفاق سے جانبر ہو گیا تو خیر ورنہ ان مقالات کا معاوضہ
میری بیوی گلزار بیگم کو ذریعہ منی آرڈر یا دستی اس پتہ پر
بھیج دیا جاوے ستمبر تک کا حساب صاف ہو چکا ہے ۔

نیاز منزل ۔ ناظم آباد (۲)

K. 15/3 کراچی

ہو سکتا ہے کہ یہ میری آخری تحریر آپ کے نام کی ہو خدا حافظ

نیاز فتحپوری

اس تحریر کو محفوظ رکھئے تو مناسب ہے اس خط (کا)
جواب اگر آپ نے دیا تو بڑا کرم ہو گا کیونکہ میں جانتا ہوں
آپ خطوں کا جواب نہیں دیتے "

اس میں جہاں اور بہت کچھ ہے احساس فرض بھی نمایاں ہے ۔
مرض الموت میں بھی نیاز کے حوصلے بلند ولولے جوان اور ہمت قوی رہی محب
گرامی پیرزادہ لطیف الرحمان صدیقی طبع پرسی کے لئے جانے لگے تو ملا واحدی
صاحب نے کہا یہ فرض میری طرف سے بھی ادا کر دیجئے گا معذور ہوں ورنہ
خود حاضر ہوتا پیرزادہ جب ہسپتال سے رخصت ہونے لگے تو نیاز نے فرمایا
واحدی صاحب سے کہہ دیجئے گا میں موت سے نہیں ڈرتا وہ تو اسلام کر دے گی

[1] نو یا آٹھ ؟ (انیس)

میں مسلمان ہوں اور مسلمان مروں گا اس کے گواہ آپ ہیں "یہی نہیں بلکہ انکے قلم سے یہ فقرہ بھی موجود ہے۔ "میں ایک سنی مسلمان ہوں اس سے نہ کچھ زیادہ نہ کم۔"

کوئی علاج کارگر نہ ہوا اور وہ بھی مر گیا جس کی موت پر ممکن ہے آسمان خود بھی پشیمان ہوا ہو "نگار" زندہ ہے مگر کب تک کل وہ آج اس کی باری ہے، البتہ نگارشات نیاز امر ہیں گویا نیاز مر گئے لیکن مر نہیں سکتے رئیس امروہوی کا قطعہ تاریخ جنگ میں چھپ چکا ہے ایکبار پھر پڑھ لیا جائے تو اچھا۔

بدیعہ نگار و کرشمہ طراز

نگار دبستانِ اردو "نیاز"

وہ سرمایۂ نازِ اربابِ فن — بہ اسلوب تازہ بہ طرزِ کہن

وہ صدرِ بساطِ سخن گستری — وہ علامۂ فنِ دانشوری

وہ طباعِ اے طبعِ نکتہ نواز — وہ طناز انشا کو خود جس پہ ناز

وہ باقی رہے گا وہ فانی نہ تھا — ادب میں کوئی اس کا ثانی نہ تھا

ہوا رتبۂ وصل سے سرفراز — رئیس آہ ہجرِ جنابِ نیاز

رقم کر قلم اے قلم

نیازِ نگارِ بہشت رقم

۱۳۸۶ھ (۲۹ دسمبر ۱۹۶۸ء)

مکتوبات

$\frac{3}{11}$ عزیزم، خط ملا، پڑھ کر افسوس ہوا کہ آپ نے تضیع اوقات کو کافی دیر میں محسوس کیا بہر حال غنیمت ہے کہ اب بھی آپکو اسکا خیال آیا اور اس کی

تلافی کے لئے آپ آمادہ ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ جعفری صاحب کے پاس رہ کر آپ کی تعلیم کیونکر پوری ہو سکتی ہے اور وہ اتنا وقت کیونکر دے سکتے ہیں میری رائے یہ ہے کہ آپ اردو کالج کراچی میں داخل ہو جائیں اور اگر وہاں کوئی بورڈنگ ہو تو وہیں قیام کیجئے تاکہ آپ کی نگرانی ہو سکے آپ میرا یہ خط اپنے والد محترم کو دکھا دیجئے دیکھئے وہ کیا فرماتے ہیں ۔

روشن صدیقی صاحب کا پتہ صرف مرادآباد غالباً کافی ہوگا" لالہ صحرا" کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ روش صاحب کا انتخاب اسکی ادارت کے لئے کس نے کیا اور کیوں بہت پرانی بات ہے اس کو جان کر کیا کیجئے گا جو کچھ ہونا تھا ہو چکا ۔

فی الحال میرے پاکستان آنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی آپ کبھی ہندوستان آئیں تو ضرور ملئے اپنی تصویر بھی بھیج دوں گا، نیاز (۱۹۵۵ء)

(۲)

$\frac{1}{12}$ عزیزم، تصویر بھیج رہا ہوں اردو کالج میں داخل ہونے کے لئے براہ راست مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو پاکستان اسپتال روڈ کراچی سے معلومات حاصل کیجئے اور ان کو لکھ دیجئے کہ ارباب اردو کالج باوجود بار بار یاد دہانی کے کوئی اطلاع نہیں دیتے اس لئے مجبوراً آپ سے خطاب کیا جاتا ہے، اپنے والد محترم کی خدمت میں میرا سلام شوق پہونچا دیجئے

نیاز (۱۹۵۵ء)

(۳)

لکھنؤ، ۲۱/۳ صادق آباد کے میر صاحب (محبی میرزا احد حسین) نے ذریعہ ڈرافٹ قیمت یہاں روانہ کر دی تھی پاکستان نہ منی آرڈر جا سکتا ہے نہ وہاں سے آ سکتا ہے، شاہنامہ فردوسی میر صاحب کے پاس بھیجا جا رہا ہے نایاب کتابیں ایک اور صاحب کی ہیں اور انہیں قیمت نقد ادا کرنا پڑتی ہے، نیاز [۱۹۵۶ء غالباً میں نے یہ لکھا ہوگا کتابیں بھجوا دیجئے رقم یہاں آپکے نمائندے کو ادا کر دی جائے گی، انیس]۔

(۴)

لکھنؤ ۵/۴ عزیزم سلمہٗ کمیاب کتابیں صرف اسی صورت سے مل سکتی ہیں کہ یہاں رقم پہونچ جائے وہاں قیمت جمع کرنے سے نہیں مل سکتیں آپ ذریعہ بنک ۵۴ء کا ڈرافٹ نگار کے نام بھجوا دیجئے شاہنامہ وغیرہ بھیج دی جائیں گی پاکستان سے ہر شخص ۵۴ء کی کتابیں یہاں سے طلب کر سکتا ہے اور اسی رقم کا ڈرافٹ ذریعہ بنک روانہ کر سکتا ہے، نیاز (۱۹۵۶ء)

(۵)

لکھنؤ ۲۳/۱۰ عزیزم، نظیر صدیقی کا پتہ یہ ہے۔

16/A . AKHOY DAS LANE فرید آباد ڈھاکہ، مارچ کا پرچہ کراچی میں بھی ختم ہوگیا، فی الحال پاکستان آنے کی کوئی صورت نہیں، اپنے والد کی خدمت میں میرا اسلام پہونچا دیجئے، دعا گو نیاز (۱۹۵۶ء)

(۶)

لکھنؤ ۳/۱۲ گرامی عزیز اگست ۵۴ء اور مارچ ۵۶ء کا نگار اب نہیں مل سکتا کوئی کاپی باقی نہیں رہی۔

میں خدا کے وجود کا قائل ہوں لیکن ایک، قوت بے پایاں کی حیثیت سے، میں اسے فریدوں، کیخسرو، چنگیز و ہلاکو نہیں سمجھتا جو غصہ بھی کر سکتا ہے اور خوش بھی ہو سکتا ہے وہ نہ ہماری عبادت کا محتاج ہے اور نہ ہماری سرکشی پر برہم ہوتا ہے وہ بے نیاز مطلق ہے اور ہماری التجائیں وہاں باریاب نہیں ہو سکتیں وہ ایک قوت ہے جو نظامِ عالم کے قیام کی ذمہ دار ہے اور جو اصول اس نے مقرر کر دیئے ہیں ان میں تبدیلی ممکن نہیں وہ نہ جذبۂ رحم رکھتا ہے نہ جذبۂ انتقام بہشت و دوزخ اس کے یہاں کوئی معنی نہیں، کھتی جو جیسا کریگا اس دنیا میں اس کا نتیجہ پائے گا دنیاوی زندگی کے بعد روح کا وجود بھی جسم ہی کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے حشر و نشر بالکل مہمل عقیدہ ہے، دعاگو نیاز۔

(۱۹۵۶ء) "انسان کا وجود ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتا ہے" یہ فقرہ قلم زد پایا گیا: انیس)

(۷)

لکھنؤ $\frac{۱}{۵}$، شور کا پتہ یہ ہے P.22. SANTPURA LYALLPUR ساغر کا: آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی، نیاز (۵-۱-۵۷)

(۸)

$\frac{۲۱}{۲}$ ۱۔ روش صاحب کا پتہ آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی ہے۔

۲۔ "لے آئے" صحیح ہے (یعنی لوالائے غیر فصیح، انیس)

۳۔ مشکور جس معنی میں مستعمل ہوتا ہے صحیح نہیں لیکن اب اردو میں سب شکر گذار کے معنی میں لکھنے لگے ہیں میں احتراز کرتا ہوں، دعاگو نیاز

(۱۹۶۱ء)

(۹)

لکھنؤ ۱۵/۹ آپ نے بالکل غلط سنا میں مرحوم کی خدمات کا بڑا معترف ہوں، انتقال کے دن ریڈیو والے میرے پاس آئے تھے اور میں نے ان کو اپنا پیامِ تعزیت لکھوا دیا تھا کہ مرحوم کے متعلق کچھ کہنا بیکار ہے، آفتاب آمد دلیل آفتاب، اور میرا یہ پیام ریڈیو سے نشر بھی ہوا تھا، نیاز

(۱۹۶۱ء۔ خبر یہ اڑ گئی تھی کہ مولوی عبدالحق کے انتقال پر نیاز صاحب نے تعریفی نہیں تعریفی کلمات کہے، اتفاق سے کراچی میں مقیم تھے۔)

(۱۰)

لکھنؤ ۱۷/۵، خط ملا، تعمیل ارشاد ممکن نہیں آئندہ اس قسم کی باتیں خط میں نہ لکھا کیجئے بالکل خلاف قانون بات ہے آپ مصیبت میں پھنس جائیں گے، نیاز (۱۹۶۲ء میں نے لکھا تھا نوح ناروی مرحوم کو تین سو روپے منی آرڈر کر دیجئے میں یہ قرض جب آپ پاکستان تشریف لائیں گے تو ادا کر دوں گا، یہ قیمت لگائی تھی نوح نے تصویر منی بائی حجاب محبوبہ داغ کی، بعدہٗ وہ سوا سو تک بھی آ گئے تھے میں ترسیل زر کے لئے کوشاں تھا کہ وہ اللہ کو پیارے ہوئے، وہ تصویر کیا ہوئی کچھ خبر نہیں، انیس)

(۱۱)

۲۶/۵ کراچی عزیزم سلمہٗ، ڈاکٹر عبدالحق مرحوم مسلمان تھے آپ کو انکے مذہبی مسلک کی جستجو کیوں ہے دعاگو نیاز (۱۹۶۳ء مولوی عبدالحق کے مذہبی مسلک پر قلم اٹھانے سے پہلے میں نے مرحوم کے معاصرین سے "پوچھ گچھ" کی تو

دو چار کے علاوہ سب طرح دے گئے، انیس)

(۱۲)

۲/۶ مرحوم آزاد خیال مسلمان تھے پکے موحد تھے اور مسئلہ خلافت و امامت میں وہ سختی کے ساتھ حنفی ۔ اپنے والد سے میرا سلام کہہ دیجئے میرے خط کا جواب انہوں نے نہیں دیا کیا برہم ہیں ؟ نیاز (۱۹۶۳ء بسلسلہ مولوی عبدالحق)

(۱۳)

۲۵/۱ صاحب عصمت زیادہ مناسب ہے، نیاز (مولوی عبدالحق (۱۹۶۳) سنا ہے انجمن کو مالی مشکلات کے بھنور سے نکالنے کیلئے تقادا لغای معمے حل کرنے لگے تھے، مولوی صاحب ظفر نیازی سے بر مہینے پانچسو لے کر اپنے قلم سے خانہ پری کر دیتے اور وہ اسے بنک میں رکھوا کر لاکھوں کا کھیل کھیلتے، واقعہ یہ ہے کہ تقسیم ملک کے بعد انجمن اور مولوی صاحب دونوں کی حالت دگرگوں ہو کر رہ گئی تھی، مجھے مولوی صاحب کے ایک حل میں "باعصمت شوہر" کی ترکیب کھٹکی تھی ۔ انیس)

(۱۴)

۱۴/۵ ہاں ایک بات لکھنا بھول گیا تھا وہ یہ کہ جن کے مضامین کا انتخاب ضرور شائع کیجئے یہ چیز کام کی ہوگی میرے پاس اس کا کوئی پرچہ موجود نہیں بلکہ زیادہ مناسب ہوگا کہ فائل مجھے بھیج دیجئے اور میں انتخاب کر دوں، دعا گو نیاز (۱۹۶۳ء)

(۱۵)

۸؍جون ۶۴ کراچی، گرامی عزیز سرفراز کے نام آپ کا خط ملا،
نرگس کا تازہ شمارہ میری نگاہ سے نہیں گذرا، تبادلہ میں متعدد رسائل وجراید
آتے ہیں ان میں صرف دو چار میں دیکھتا ہوں باقی کیا ہوتے ہیں مجھے نہیں
معلوم، دفتر کا کام عارف کے سپرد ہے اور وہ بالکل تنہا ہے اسی کو لکھئے کہ
وہ آپ کو بھیج دیا کرے، اپنے والد محترم کی صحت وعافیت کی اطلاع دیجئے
میں نے انہیں خط لکھا تھا کہ وہ لاہور جاکر کسی اچھے ڈاکٹر سے تشخیص مرض
کرالیں لیکن انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا خدا کرے اب صحیح ہو دعا گو ہوں، نیاز

(۱۶)

عزیزم خط مل گیا شکریہ کاتب نے میری تحریر کو بالکل مسخ کر دیا میں
نے لکھا تھا کہ "بہ سلسلۂ قتیل صاحب برہان قاطع نے غالب کی ——"
برہان قاطع کا مصنف رشک محمد حسین تبریزی تھا اور برہان تخلص کرتا تھا
مخدرات مغلیہ کے بالکل یقینی وصحیح حالات معلوم ہونا دشوار ہے کتب تاریخ
میں جستہ جستہ ان کا ذکر ملتا ہے اور وہ بھی اختلاف کے ساتھ، دعا گو نیاز
[مہر ڈاکخانہ ۲۴۔۸۔۱۹۶۴ء]

(۱۷)

عابد منزل۔ ناظم آباد ۲؍۔ کراچی (۱۸) [مہر ڈاکخانہ ۱۲۔۹۔۶۴ء]
عزیزم، استفسار مل گیا نگار میں شائع ہوگا آپ کا خیال بالکل
درست ہے عبد الماجد صاحب کا یہ ارشاد کہ کنیزوں سے اختلاط کے لئے

نکاح ضروری نہیں درست نہیں احکام قرآنی کے خلاف ہے اس پر میں مفصل گفتگو کروں گا، مراسلت کے لئے اوپر کا پتہ نوٹ کر لیجئے یہ مکان میں نے لے لیا ہے، دعاگو نیاز [مہر ڈاکخانہ ۱۲ - ۹ - ۱۹۶۴ء]

(۱۸)

کراچی ۲۲/۱۰ عزیزم، مضمون واپس کر رہا ہوں مولوی عبدالحق کے مذہبی مسلک پر اظہار خیال نہ مذہب کی خدمت ہے نہ ادب کی، حیرت مرحوم کا کوئی خط میرے پاس محفوظ نہیں، دعاگو نیاز (۱۹۶۴)

(۱۹)

علیہ منزل ناظم آباد (۲) کراچی ۱۱/15 عزیزم، آپ کا مضموں یوں تو بہت خوب تھا لیکن اس کی اشاعت غالباً ضروری نہ تھی اس لئے وہ ذریعہ رجسٹری واپس کر دیا گیا تھا مل گیا ہوگا اپنے والد محترم کی خدمت میں سلام نیاز پہونچا دیجئے دعاگو نیاز (۶۴ء)

(۲۰)

کراچی ۲۲/۱۱ عزیزم آپ میں مضمون نگاری کی بڑی اچھی اہلیت پائی جاتی ہے اس لئے اس کا صرف بھی کسی بہتر موضوع پر ہونا چاہئے اپنے والد محترم کو میرا سلام پہونچا دیجئے دعاگو نیاز

[۱۹۶۴ء ۔ اس خط کا بڑا حصہ اوراق گذشتہ میں آچکا ہے]

(۲۱)

۲۱/۱۲ عزیزم آپ نے اچھا کیا کہ حیرت مرحوم کے خطوط یکجا کر لئے لیکن

افسوس ہے کہ ادارہ نگار انہیں کتابی صورت میں شائع کرنے سے معذور ہے خود من ویزداں کی کاپیاں کتابت کی ہوئی عرصہ سے پڑی ہیں اور روپیہ کی کمی کی وجہ سے نہیں جا سکیں، دعاگو نیاز (۱۹۶۴)

(۲۲)

یکم جنوری، یہ شعر حزیں کا ہے مجھے معلوم ہے لیکن شبلی نے اس میں تصرف کیا ہے حزیں کا مصرع ہے، "نرچشم آمیتس بر دارم وگوہر تماشہ کن" شبلی نے اسے بردار وگوہرا کر دیا ہے اور اسی تصرف کا ذکر میں نے کیا تھا نیاز (۱۹۶۵)

(۲۳)

عابد منزل ناظم آباد (۲) ۱۳/۱ھ عزیزم سلمہ فکر نہ کیجئے یہاں کے حالات اس قدر تشویشناک نہیں جتنے آپ نے ظاہر کئے ہیں اپنے والد محترم کی خدمت میں سلام شوق دعائے صحت پہونچا دیجئے، دعاگو نیاز [صدر ایوب کے انتخاب جیتنے پر ہنگامے ہوئے تھے]

متفرقات

(۱) ۲۵۔ اگست عزیزم سلمہ آپ کا خط ملا بڑی خوشی ہوئی افسوس ہے کہ آپ بہت کم وقت لے کر آئے اور میری آخری تمنا پوری نہ ہو سکی۔ بہر حال خوش رہیئے اپنے والد اور اپنی امی کو میری دعا پہونچا دیجئے دعاگو بیگم نیاز [قلم نیاز صاحب کا ہی ہے]

لکھنؤ ۲۱/۲ نگار کا سالانہ چندہ 6/8 ذریعہ منی آرڈر ذیل کے پتہ

بھیج کر رسید ڈاکخانہ یہاں بھیج دیجئے پرچہ براہ راست آپ کو ملتا رہے گا
ڈاکٹر ہاشمی ۵ .۱.۵ گارڈن ویسٹ کراچی، مینیجر ۷؍۱۹۵۶ء)

(۳) نگار لکھنؤ ۲۱/۵ تسلیم سالنامہ ۵۶ء اور اپریل کے شمارے ذریعہ
رجسٹری ارسال خدمت ہیں مارچ کا پرچہ براہ راست آپ کو کراچی سے ملیگا
اس لیئے آپ کی خریداری جنوری ۵۶ء سے محسوب ہوگی مینیجر

(۴) لکھنؤ نگار ۲۱/۱ تسلیم نوادرات کی قیمت آپ اس وقت دریافت
فرمائیے جب آپ وہاں سے روپیہ بھیجنے کا انتظام کر سکیں یوں پوچھنا بیکار ہے
فاروقی (۱۹۶۰ء)

ذریعہ دفتر نگار ۔ لکھنؤ ۱/۲ مکرمی تسلیم آپ بنک ڈرافٹ سے کوئی
رقم یہاں نہ بھیج سکیں گے پہلے وہاں دریافت کر لیجیے کہ آپ کس قدر رقم بیک
وقت یہاں بھیج سکتے ہیں کیونکہ یہ معاملہ تو ہزاروں کا ہے، فاروقی (۱۹۶۰ء)

درسِ ادب اگر بود زمزمۂ محبتے

کسی کے وہم وگمان میں بھی کہاں تھا کہ جوش ملیح آبادی اور نیاز فتحپوری یوں ایک دم سے لڑھک کر پاکستان آجائیں گے جوش تو ٹھہرے رند آگئے سکندر مرزا کے بھرے میں اور اپنی بسی بسائی دنیا اجاڑ کر رکھ دی نیاز پر اللہ ہی جانے کیا افتاد پڑی، نہ ملے دلی اور لکھنؤ میں تھے پاکستان آکر دونوں بہم دوش ایک ہی شہر اور اخبار میں دو بدو اپنے جوہر دکھانے لگے، یہ اتفاق بڑا ہی غریب ہے کہ جوش پر صادق آنے والا عنوان "رنگا رنگ" تو نیاز لے اڑے اور "علم وفکر" کا لبادہ جوش نے اوڑھ لیا، رنگارنگ پر کبھی کبھار کچھ شیریں کچھ تلخ یادوں کے چھینٹے بھی پڑ جایا کرتے تھے انہی یادوں میں ایک یاد ڈاکٹر غلام جیلانی برق سے اپنی مطبوعہ مراسلت سے تازہ کی گئی تھی جسے پڑھ کر ڈاکٹر برق نے بھی "میں اور علامہ نیاز فتحپوری" کے عنوان سے ایک مراسلہ روزنامہ جنگ کراچی کی اشاعت مورخہ ۱۲ فروری ۶۴ء میں چھپوا دیا تھا، صحیح تاریخ ۱۱ فروری یہ ایک دن آگے کی تاریخ ڈالنے کا چکر نہ جانے کب ختم ہوگا، مراسلہ یہ تھا

"۲۸ جنوری ۱۹۶۴ء کے "جنگ" میں علامہ نیاز نے "میں اور غلام جیلانی برق" کے عنوان سے دو مکتوب شائع فرمائے ہیں، ایک وہ گستاخانہ خط جو میں نے انہیں لکھا تھا اور دوسرا

اس کا جواب یہ واقعہ ۱۹۲۹ء کا ہے یہ وہ زمانہ ہے جب
مسلمانوں کی منجمد فکر میں اقبال اور مشرقی رحمۃ اللہ علیہم کی
وجہ سے شدید زلزلے اٹھ رہے تھے اگر کوئی کسر تھی تو وہ علامہ
نیاز فتحپوری پوری کر رہے تھے نیاز غیر قرآنی عقائد وضعی روایات
ملائے اسلام اور مذہبی رسوم و شعائر کے محلات پر بجلیاں
برسا رہا تھا لیکن "جوش جہاد" میں بارہا حدود کو پھلانگ جاتا تھا
میرا وہ گستاخانہ خط اسی روش کے خلاف ایک ہلکا سا
احتجاج تھا اس خط کے بعد میں اور نیاز ایکدوسرے کے بہت
قریب آ گئے میرے بڑے بھائی پروفیسر غلام ربانی عزیز نیاز صاحب
کے بہت بڑے حامی اور ان کے فکر و فلسفہ کے پرجوش مبلغ تھے
انہوں نے نیاز صاحب کو کیمبلپور آنے کی دعوت دی انہوں نے
دوریٔ منزل اور مصروفیات کا عذر پیش کیا لیکن بھائی جان
نے اس قدر اصرار کیا کہ وہ تشریف لے ہی آئے اور چار روز ہمارے
یہاں رہے یہ چار دن مجھے کبھی نہیں بھولیں گے صبح سے رات کے
بارہ بجے تک طلبہ اساتذہ وکلا اور دیگر اہل علم کا ایک ہجوم رہتا تھا
بحثیں چھڑتی تھیں تاریخی ثقافتی مذہبی ادبی اور فلسفیانہ مسائل
پر سوال و جواب ہوتے تھے انہی دنوں آپ نے طلبہ کو بھی خطاب
فرمایا اور "درسِ ادب اگر بود زمزمۂ محبتے" کے عنوان سے ایک
خاصہ طویل مقالہ پڑھا جو میرے پاس آج تک محفوظ ہے کبھی کبھی

سوچتا ہوں کہ میں نے اس حکیمانہ تحریر کو آج تک شائع کیوں نہیں کرایا؟ کوئی جواب ہو تو دوں میں ۱۹۲۵ء سے تقسیم ملک تک "نگار" کا باقاعدہ مطالعہ کرتا رہا اور پھر یہ سلسلہ منقطع ہو گیا نہ جانے آجکل نیاز صاحب فکر و دانش کی کس منزل پر ہیں۔

عام مشاہدہ تو یہی ہے کہ "عمر عزیز" چالیس سال سے گذر جائے تو وجدان کی آنکھ کھل جاتی ہے یہ وہی آنکھ ہے جو کوہساروں کے بلند و پست سلسلوں اور ستاروں کی بکھری بکھری محفل میں رشتۂ وحدت دیکھ سکتی ہے اور حجاباتِ کون و زماں کو چیر کر شاہد کائنات تک جا پہنچتی ہے اتنا بڑا جینیس (نابغہ) اس عطیے سے محروم رہے! ناقابل تسلیم، اسلامی تاریخ فکر میں نیاز کو بہت بڑا مقام حاصل ہے آج اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ کوئی مورخ ہمارے فکر کی تاریخ لکھے، غزالی، رازی، رومی، ابن تیمیہ محدث دہلوی افغانی، سرسید اور اقبال کے فلسفے پہ روشنی ڈالے اور اسی سلسلے میں **نیاز کا مقام بھی متعین کرے، یہ کون کرے گا؟**

اس کا جواب مستقبل ہی دے سکتا ہے۔

اس مراسلہ میں باعث کشش یہ فقرہ تھا۔ "کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ میں نے اس حکیمانہ تحریر کو آج تک شائع کیوں نہیں کرایا؟" قلم اٹھایا اور برق صاحب کو لکھا اگر وہ حکیمانہ تحریر میرے حوالہ کردی جائے تو اس کی اشاعت سعادت ہی سعادت ہوگی۔ جواب ملا۔ دیکھنا یہ ہے کہ کیا ۱۹۲۸ کی تحریر کی اشاعت آج

مفید ہو سکتی ہے؟ اس لئے میں تھوڑا سا وقت نکال کر اس تحریر کو دوبارہ پڑھونگا آپ صرف اتنی تکلیف فرمایئے کہ آج سے ایک ہفتہ بعد ایک کارڈ لکھ کر مجھے یاد دلادیں میں انشاء اللہ فوری کارروائی کروں گا۔" اور واقعی یاددہانی پر تقریر رجسٹرڈ مل گئی، اکیلے تقریر کی اشاعت کچھ جی کو نہ لگی اور میں نے غلام ربانی صاحب عزیز اور جناب نیاز کو بھی متوجہ کیا، میزبان چونکہ عزیز صاحب تھے اس لئے میری استدعا پر موصوف نے کسی قدر تفصیل سے کام لیا۔

مکرمی سلام مسنون، آپ کا خط کئی دنوں سے جواب کا تقاضا کر رہا ہے لیکن چونکہ کالج میں یہ وقت غیر معمولی مصروفیات کا ہوتا ہے اس لئے خط کے جواب میں تاخیر ہو گئی آپ کے سوالات کے جواب میں یوں عرض پرداز ہوں۔

یہ ۱۹۲۶ء کا واقعہ ہے میں گورنمنٹ ہائی سکول پنڈی گھیپ میں ملازم تھا کبھی کبھی "نگار" کا پرچہ دیکھنے کا اتفاق ہوتا پروفیسر محی الدین زور جو بعد میں ڈاکٹر ہو گئے تھے ان کا ایک مضمون جس کا عنوان غالباً "غالب اور جذبۂ رشک" تھا، "نگار" میں شائع ہوا مضمون بڑی محنت سے لکھا گیا تھا لیکن اسکی ایک شق سے مجھے کچھ اتفاق نہ تھا چنانچہ میں نے اپنے خیالات کا اظہار ایک مضمون میں کیا اور مولانا نیاز کو بھیج دیا جس کو دیکھ کر مولانا نے ایک کارڈ پہ چند سطور لکھ کر یوں میری ہمت افزائی کی ۔ "آپ پنڈی گھیپ میں کہاں سے نکل آئے مجھے تو اہل علم کی ہمیشہ جستجو رہتی ہے اپنے حالات لکھئے۔" مجھے اس خط کے پڑھنے سے بڑی مسرت ہوئی کیونکہ یہ ہندوستان کے ایک

بہت بڑے ادیب کے قلم سے ایک ایسے شخص کے بارے میں لکھا گیا تھا۔ جس نے اس میدان میں ابھی ابھی قدم رکھا تھا میرا یہ مضمون غالباً دسمبر ۱۹۲۶ء کے "نگار" میں شائع ہوا تھا مئی ۱۹۲۷ء میں میری تبدیلی گورنمنٹ نارمل سکول کیمبلپور میں ہوگئی یہاں کے حالات کچھ زیادہ سازگار تھے اس لئے میں نے کوئی دس بارہ خریدار "نگار" کے لئے مہیا کئے اور مولانا کو اطلاع دیدی دوسرے سال نئے خریداروں کی تعداد پچیس تک پہنچ گئی اس سے میرے اور مولانا کے تعلقات زیادہ گہرے ہو گئے۔

۱۹۲۹ء کے جاڑوں کا واقعہ ہے میں نے خواب میں دیکھا کہ مولانا کیمبل پور تشریف لائے ہیں بر سبیل تذکرہ میں نے اس خواب کا ذکر ایک خط میں مولانا سے کر دیا انہوں نے جواب میں لکھا کہ ہاں انہوں نے بھی اسی قسم کا خواب دیکھا ہے کہ وہ کیمبل پور میری دعوت پر آئے ہیں اور میں نے ان کے سامنے "نگار" کے تقریباً ننّو نئے خریداروں کی ایک فہرست پیش کی ہے مولانا کا یہ حسن تقاضا میری سمجھ میں آگیا اور میں نے انہیں کیمبلپور تشریف لانے کو کہا چنانچہ وہ ایک صبح، دن اور تاریخ تو اس وقت یاد نہیں ہمارے ہاں رونق افروز ہوئے میں اور عزیزی برقی کے علاوہ دو چار نارمل جماعتوں کے طالب علم سٹیشن پر ان کی پذیرائی کے لئے گئے تھے۔

میں ان دنوں بورڈنگ ہاؤس کا سپرنٹنڈنٹ تھا۔ مولانا میرے کمرے میں ہی ٹھہرے۔ پہلا دن کچھ تکلفات میں ہی گذر گیا، اور ہم کھل کر کوئی گفتگو نہ کر سکے چنانچہ مجھے یاد ہے کہ مولانا سارا دن چارپائی پر بیٹھے رہے اور انہوں

نے اپنی پتلون بدلنے کی زحمت بھی گوارا نہ کی اور نہ ہمیں ہی توفیق ارزانی ہوئی
کہ ہم اپنے اس مہمان عزیز سے اس شکنجہ سے نکلنے کی استدعا کرتے اب بھی،
جب کبھی یہ منظر آنکھوں کے سامنے آتا ہے تو ایک قسم کی ذہنی اذیت ہوتی
ہے کہ ہم نے مولانا کو سارا دن کیوں اس طرح مبتلائے تکلیف رکھا شام
کو ہمارے ایک دوست کے یہاں جن کا نام قاضی اکرام حسین تھا دعوت
تھی ہمارے کہنے پر مولانا بھی اس میں مدعو کیے گئے تھے نشست فرش پر تھی
اس دعوت میں میاں احسان الحق سیشن جج بھی بلائے گئے تھے میاں صاحب
علی گڈھ کے تعلیمیافتہ اور بڑے باذوق انسان تھے مجلسی گفتگو کے بادشاہ تھے
لب ولہجہ نہایت شستہ اور گفتگو عام طور پر شعر وسخن سے متعلق ہوتی تھی میں نے
میاں صاحب سے مولانا کا تعارف کرایا وہ پنجابی تھے چنانچہ مولانا سے بڑی
گرم جوشی سے بغل گیر ہوئے مگر مجھے یوں محسوس ہوا کہ مولانا نیاز غالباً
اس بے تکلفی کے لئے آمادہ نہیں تھے بہرحال جب گفتگو شروع ہوئی تو موضوع
وہی شعر وسخن تھا، میاں صاحب نے مولانا سے درخواست کی کہ وہ اپنی کوئی
نظم یا غزل سنائیں مولانا کا جواب بڑا دلچسپ اور مختصر تھا: "اپنا شعر مجھے کوئی
یاد نہیں اور دوسروں کے شعر میں سنایا نہیں کرتا"۔ گو مولانا کے اس جملے میں
تھوڑی سی رکھائی پائی جاتی تھی لیکن میاں احسان الحق کی طبیعت باغ وبہار
تھی انہوں نے باتوں ہی باتوں ۔ ۔ ۔ میں کسی شاعر کا ایک شعر پڑھا اور
شاعر کا نام بھی لیا جو اس وقت مجھے یاد نہیں مولانا نے کہا کہ شعر تو ٹھیک ہے
لیکن شاعر کا نام درست نہیں، چنانچہ انہوں نے اس کی تصحیح کردی میاں صاحب

نے پھر ایک شعر پڑھا جس کی اسی طرح مولانا نے پھر تصحیح فرمائی میں نے اس موقعہ پر کہا کہ کل مولانا ہمارے نارمل سکول کی جماعتوں سے خطاب کریں گے میری یہ بات کہنے کی دیر تھی کہ مولانا نے جھٹ کہا: نہیں صاحب اس بات میں کوئی صداقت نہیں میں کوئی تقریر کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ میاں صاحب نے فرمایا کہ اگر مولانا تقریر کرنے پہ آمادہ ہو جائیں تو انہیں اطلاع دے دی جائے یہ محفل کوئی دو اڑھائی گھنٹے جاری رہی اور کھانے کے بعد ہم وہاں سے اٹھ کر اپنی قیام گاہ پر آ گئے مولانا نے کپڑے بدلے اور بستر پر لیٹ گئے میں نے محسوس کیا کہ پہلے کے مقابلہ میں اب وہ ذرا کھل کر بات کر رہے تھے اور تکلفات کے حجابات آہستہ آہستہ اٹھ رہے تھے۔

کیمل پور میں دسمبر کے مہینہ میں سردی پورے شباب پر ہوتی ہے دوسرے دن صبح کو اٹھے تو بوندا باندی ہو رہی تھی اور کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی مجھے ہر روز نہانے کی عادت ہے چنانچہ جب میں نہانے لگا تو مولانا سے دریافت کیا کہ آیا وہ بھی نہانے کی تکلیف کریں گے مولانا ابھی ابھی غسلخانے سے منہ ہاتھ دھو کر واپس آ رہے تھے اور سردی سے کانپ رہے تھے اپنے لکھنوی انداز میں کہنے لگے: "صاحب ہم خودکشی کر لیں گے مگر نہائیں گے نہیں"۔ اس فقرہ سے ہمیں بڑا لطف آیا دن بھر بوندا باندی ہوتی رہی اور مولانا بیٹھے کانپتے رہے اتنا یاد پڑتا ہے کہ شاید اتوار کا دن تھا ورنہ نارمل سکول میں چھٹی تھی سکول کے ایک سو ساٹھ ۱۶۰ طالب علم بورڈنگ ہاؤس میں رہتے تھے وہ متواتر تقاضا کر رہے تھے کہ مولانا ان کے سامنے اپنی پسند

کے کسی موضوع پر خیالات کا اظہار کریں میں نے گذشتہ شب کی گفتگو سے ہی اندازہ لگالیا تھا کہ مولانا تقریر کی الجھن سے بچنا چاہتے ہیں اور شائد انہیں پہلے کسی مجمع میں بولنے کا اتفاق نہیں ہوا جب ہم نے مولانا سے طلبار کی اس گزارش پر غور کرنے کے لئے اصرار کیا تو بادل ناخواستہ اس بات پر آمادہ ہو سکے کہ وہ لکھ کے اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے لئے تیار ہیں چنانچہ انہوں نے ہمیں اپنے کمرے سے باہر نکل جانے کو کہا اور یہ تقریر جو اسوقت آپ کے پاس ہے مولانا نے آدھ گھنٹے میں گھسیٹ ڈالی تقریر کا سارا تانا بانا نظیری کا یہ شعر تھا۔

درس ادب اگر بود زمزمۂ محبتے
جمعہ بہ مکتب آورد طفل گریز پائے را

سکول کے ہال میں ایک سو ساٹھ (۱۶۰) طلبا جمع ہوئے اور جب مولانا تقریر پڑھنے کے لئے اٹھے تو میز پر ہم نے کوئلوں کی ایک انگیٹھی دہکا رکھی تھی اور مولانا کچھ سردی سے اور زیادہ تر گھبراہٹ سے کانپ رہے تھے چونکہ تقریر ادب عالیہ کا ایک عمدہ نمونہ تھی اس لئے بہت پسند کی گئی۔

اسی شام کو مولانا کی واپسی تھی روانگی کے وقت ہم نے مولانا کو "نگار" کے نئے خریداروں کی ایک فہرست پیش کی جن کی تعداد ترسیٹھ (۶۳) تھی مولانا ان دنوں ایک اور رسالہ "جن" کے نام سے بھی نکالتے تھے غالباً بتیس (۳۲) خریدار اس رسالہ کے لئے مہیا کئے گئے تھے ہمیں اسوقت یہ شعور ہی نہ تھا کہ مولانا کے ساتھ ایک فوٹو اتروا لیا جائے تاکہ اس واقعہ کی یادگار رہے

گاڑی کیمل پور سے رات کے دس بجے چلتی تھی ہم اور چند طلبا مولانا کو الوداع کہنے کے لئے ریلوے سٹیشن پر گئے سیکنڈ کلاس میں اوپر کی صرف ایک برتھ خالی تھی مسافر سو رہے تھے بڑی مشکل سے دروازہ کھلوایا گیا تھا اور ہم مولانا کو اس برتھ پر بٹھا کر رخصت ہوئے سو اتفاق سے اس کمپارٹمنٹ میں باقی مسافر فوجی گورے تھے نہ معلوم مولانا کا سفر کیسے کٹا ہوگا راستہ میں انہیں لاہور اترنا تھا، کیونکہ وہ یہاں آنے سے پیشتر ہی اختر شیرانی مرحوم کو اپنے آنے کی اطلاع دے چکے تھے

ان واقعات سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ ان تعلقات کی نوعیت ابتداً بہت حد تک کاروباری تھی لیکن یہ میری جوانی کا زمانہ تھا اور اہل علم سے مجھے ایک طرح کا دلی لگاؤ ہو جایا کرتا تھا اب بھی کہ اس واقعہ پر تقریباً چونتیس برس بیت چکے ہیں یہ واقعہ بمعہ اپنے اکثر جزئیات کے میرے دماغ میں محفوظ ہے اور کم از کم میرے جذبات مولانا کے بارے میں ابھی تک تقریباً وہی ہیں اس دوران میں ایک وقت ایسا بھی آیا، سال یا تاریخوں کا تعین تو اس وقت ممکن نہیں، جب مولانا نے مجھے یہ لکھا تھا: اگر آپ دفتر "نگار" سے وابستہ ہونا چاہیں تو کتنے معاوضہ پر آنے کے لئے تیار ہو سکیں گے؟ قدرت کو اس سکیم کی تکمیل منظور نہ تھی اور بہت اچھا ہوا کہ میں نے یہ قدم نہیں اٹھایا یہ ضرور ہے کہ دفتر "نگار" میں رہ کر میں ایک اچھا ادیب تو شاید بن جاتا لیکن پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لئے صرف ادیب بننے سے کام نہیں چل سکتا۔

تیسرے سوال کا جواب، جس میں آپ نے مجھ سے یہ دریافت کیا ہے کہ مولانا کتنے دن میرے یہاں ٹھہرے اس صحبت کی تھوڑی بہت تفصیل آپ کے پہلے سوال کے جواب میں عرض کر چکا ہوں۔

یہ بے محل نہ ہوگا اگر میں اس موقعہ پر مولانا نیاز کے بارے میں اپنی ناقص رائے کے اظہار کی جراءت کروں میرے خیال میں ہندو پاک میں اس وقت کوئی ایسی ہستی موجود نہیں جو ادیب اور نقاد ہونے کے لحاظ سے مولانا کے ہم پلہ کہی جا سکے کم و بیش ان کی اکثر تحریریں میری نگاہ سے گذری ہیں، اور اپنے اسی مطالعہ کی بنیاد پر ہی میں نے یہ رائے قائم کی ہے اور میرا اندازہ ہے کہ میری یہ رائے سراسر مبنی بر حقیقت ہو

ادب و تنقید سے ہٹ کر مولانا نے مذہب اور تعلیمات مذہب پر بھی بہت لمبی چوڑی خامہ فرسائی کی ہے اور وہ اسے بھی اپنی ایک تعمیری خدمت قرار دیتے ہیں افسوس ہے کہ میں اس باب میں مولانا سے متفق نہیں ہوں ان کی نیت ممکن ہے کہ تعمیری پہلو لیے ہوئے ہو لیکن اس کوشش کا جو نتیجہ ہم اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہے ہیں وہ سراپا تخریبی ہے ہمارے عوام اور مذہب کا ایک خاص مزاج ہے یہ مزاج گذشتہ چودہ صدیوں کے عرصے میں اتنا پختہ ہو گیا ہے کہ اسے باسانی دل و دماغ سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا لیکن پڑھا لکھا طبقہ جو پہلے ہی مرض تشکیک کا شکار ہوتا ہے فوراً بھٹک جاتا ہے افسوس ہے کہ اکثر اس موضوع پر گفتگو کرتے وقت مولانا کا لب و لہجہ ضرورت سے زیادہ

تیز و تند ہوجاتا رہا جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ ہر وہ شخص جس نے
مولانا کی ان تحریرات کو پڑھا اس کے دینی اعتقادات متزلزل ہوگئے اور
چونکہ مولانا کی تاویلات ہماری روایات اور مذہب کے مزاج سے سازگار
نہ تھیں اس لئے انہیں دلوں میں مستقل جگہ نہ مل سکی اگر وقتی طور پر
کسی شخص نے ان اعتقادات کو اپنا بھی لیا تو وہ جلد ہی ان فلسفیانہ موشگافیوں
سے بیزار ہوگیا، اور اس کی حالت بالکل ایسی ہوگئی۔

ازیں سو راندہ و ازاں سو درماندہ

غالباً ۱۹۳۶ء کا واقعہ ہے میں ان دنوں گورنمنٹ کالج گجرات میں
مدرس تھا کہ مولانا کی ان خلاف مذہب سرگرمیوں کی مخالفت میں ایک زبردست
ہنگامہ برپا ہوا اور مجبوراً مولانا کو عوام سے معافی مانگنی پڑی یہ معافی نامہ "نگار"
کے دو یا تین نمبروں میں شائع ہوتا رہا عوام کا حافظہ کمزور تو ہوتا ہی ہے
کچھ عرصہ کے بعد لوگ اس حادثہ کو بھول گئے اور مولانا نے پھر سے مذہب
کے خلاف لکھنا شروع کردیا میری اپنی رائے یہ ہے کہ مذہب کے بارے میں
فلسفیانہ موشگافیاں کسی طرح بھی مستحسن قرار نہیں دی جاسکتیں ان سے
فائدہ تو کچھ نہیں ہوتا البتہ نقصان ضرور پہنچتا ہے کسی اور کے متعلق تو میں کچھ
نہیں کہہ سکتا لیکن اپنے متعلق یہ ضرور کہوں گا کہ "نگار" کی تحریروں سے مجھے
اس باب میں کافی نقصان اٹھانا پڑا اور میرے عقائد کی بنیادیں بری طرح
سے ہل گئیں جب تک میں "نگار" سے آشنا نہیں ہوا تھا نماز اور روزے
کا سختی سے پابند تھا مولانا کی بے باک تحریروں سے مذہب کے تقدس کا

بت پاش پاش ہوگیا اب ہر چند اس پرانے زمانہ کو واپس لانے کی کوشش
کرتا ہوں لیکن گذرے ہوئے وقت کو کون واپس لاسکتا ہے حالانکہ بنیادی
طور پر میری تعلیم و تربیت مذہبی فضا میں ہوئی تھی ان لوگوں کا کیا حال ہوا
ہوگا جنہیں مذہب کے ابجد سے بھی واقفیت نہیں ہے اگر میرا اندازہ غلط
نہیں تو ہندو پاک میں تعلیم یافتہ مسلمانوں میں جس قدر الحاد اور خدا ناشناسی
کا دور دورہ ہے اس کی ذمہ داری بہت حد تک "نگار" کے نگارشات کے
سر ہے۔ اگر میری یہ تحریر مولانا کی نظروں سے گذری تو ہوسکتا ہے کہ انہیں
تعجب ہو رنج تو یقیناً ہوگا لیکن دیانت دارانہ طور پر میں نے جو محسوس کیا اس
کا اظہار آپ کے استفسار پر ضروری سمجھا میں بڑی شدت سے محسوس کرتا
ہوں کہ مولانا نیاز ایسے جلیل القدر ادیب اور نقاد کے شایان شان
نہیں تھا کہ وہ مذہب اور اسکی تعلیمات کو یوں کھلم کھلا ہدف تنقید بناتے

مولانا کی دست درازیوں، کی داستان یہیں ختم نہیں ہوجاتی جب
تعلیمات اسلام کی شکل مسخ ہوچکی تو بعض ستم ظریفوں نے قرآنی آیات
کے معانی ان سے دریافت کرنا شروع کردیئے الہامی کتابیں فلسفہ اور
منطق کی کتابیں نہیں ہوتیں مذہب کے بارے میں مولانا سے جو فرد گذاشتیں
ہوئی تھیں ان کی بنیاد بھی بیشتر یہی خیال تھا چنانچہ جب کوئی بات ان
سے دریافت کی جاتی تو وہ مخاطب کی ذہنی سطح کا لحاظ کئے بغیر منطق
اور فلسفہ کے باٹ تول لے کر بیٹھ جاتے اور جو جی میں آتا کاغذ سیاہ
کرتے چلے جاتے، بازار میں کپڑا ناپ کر بیچتے ہیں تو کھانڈ تول کر،

کبھی کسی شخص نے تقاضا نہیں کیا کہ کپڑے کو تول کر بیچو یا کھانڈ کو ماپ کر، اس گذارش سے میرا مطلب یہ ہے کہ مذہب کو پرکھنے کا معیار منطق نہیں ہے بلکہ ذوق سلیم ہے جسے اقبال عشق کے نام سے تعبیر کرتے ہیں اسلام میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صدیق اکبر کو جو علو مقام حاصل ہوا، اس کی بنا منطق اور فلسفہ نہیں تھا بلکہ وہ غیر متزلزل ازعان اور بے پناہ یقین محکم تھا جو امت محمدیہ میں اس شدت سے کسی اور کو نصیب نہ ہو سکا۔

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا ؛ ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

اسلام کی کوکھ سے گذشتہ چودہ صدیوں کے دوران میں بڑے بڑے جلیل القدر علما، فقہا، مجددین اور مجتہدین نے ظہور فرمایا لیکن کسی ابو حنیفہؒ بخاریؒ، رازیؒ، غزالیؒ اور ولی اللہ کو یہ جرائت نہ ہو سکی کہ وہ اصول دین سے ایسا بے رحم سلوک کرے، جو مولانا کے قلم نے روا رکھا اسمیں شبہ نہیں کہ موجودہ مذہب بیزاری میں ایک معتدبہ حصہ ہمارے نظام تعلیم کا بھی ہے جسے یورپ کے سیاسی شاطروں کا اعجاز کہنا چاہیئے لیکن مولانا کی بے باک تحریریں بچا و نگھتے کو ٹھیلنے کا بہانہ بن گئیں اور زمین و آسمان کی پہنائیوں میں اس مسموم ہوا کے دل بادل چھا گئے۔

قرآنی آیات کی تفسیر میں مولانا کی جدت پسندی نے ایسی ایسی قلمکاریاں کیں کہ انسان دیکھ کر حیران رہ جائے ممکن ہے آپ اسے مبالغہ قرار دیں میں اس دعوے کے ثبوت میں آپ کی توجہ "نگار" کے اس شمارہ کی

طرف مبذول کراتا ہوں جس کے باب الاستفسارات میں مولانا نے سورۃ الفیل کی تفسیر بیان کی ہے علامہ اقبال فرمایا کرتے تھے کہ دنیا میں قرآن پر جسقدر ظلم کیے گئے ہیں اس کی مثال نہ چین کی تاریخ میں ملتی ہے نہ سقراط کی زندگی میں، اس تفسیر کے پڑھنے سے احساس ہوتا ہے کہ اتنی مضحکہ خیز بات شائد ہی کبھی دنیا میں کہی گئی ہو، مولانا نیاز یا اس مذاق کے اور کوئی بزرگ جب قرآن حکیم کی ایسی دور از کار تاویلوں پر اتر آتے ہیں تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ اگر خدا بندوں سے حقیقتاً اسی انداز سے گفتگو کرتا جس طرح کہ یہ حضرات قرآن کی آیات کی تفسیر کرتے ہیں تو کیا ان الہامی کتابوں کا مقصد سراسر فوت نہ ہو جاتا حالانکہ خدا پکار پکار کے کہہ رہا ہے کہ، ہم نے قرآن کو آسان بنا دیا ہے کوئی ہے جو اس سے نصیحت حاصل کرے"۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ قرآن ابتدائی طور پر نازل تو ہو عرب کے ان پڑھ بدوں کیلئے اور بیان مطالب کے لئے انداز وہ اختیار کیا جائے کہ تشریح کے لئے مولانا نیاز کی تلاش کرنی پڑے کتنا بہتر ہوتا کہ مولانا اس شجر ممنوع کے قریب بھی نہ پھٹکتے مجھے اکثر خیال آتا ہے کہ کیا مولانا نے تخلیہ میں کبھی غور نہیں فرمایا کہ مذہب کی تاویل اور قرآن کی تفسیر بالرائے میں وہ دنیا سے منفرد کیوں ہیں ہمارے اسلاف میں کسی اور نے کیوں ایسی جسارت نہیں کی، اور اگر یہ عہد حاضر کی الحاد پرور فضا کا نتیجہ ہے تو اس عہد میں بھی ہندو پاک کے علاوہ اور ممالک میں پڑھے لکھے لوگ پائے جاتے ہیں جن میں علامہ رشید رضا (مرحوم) جوہری طنطاوی اور ڈاکٹر طٰہٰ، خاص طور پر قابل ذکر ہیں لیکن ان حضرات میں سے کسی بھی

قرآن کی تفسیر میں ایسی جدت کا مظاہرہ نہیں کیا ممکن ہے کہ مولانا نے اپنی کسی تحریر میں اس کی کوئی وجہ بیان فرمائی ہو اور میری نظر سے نہ گذری ہو۔

اس تحریر کے خاتمہ پر میں اس امر کا ذکر ضروری خیال کرتا ہوں کہ اگر آپ مجھ سے اس باب میں استفسار نہ کرتے تو میں لب کشائی کے لئے تیار نہیں تھا کچھ اس لئے کہ ردو قدح اور جرح و تعدیل میری افتاد طبع کے خلاف ہے اور اس لئے بھی کہ علم و فضل کے لحاظ سے مولانا کا مقام بہت بلند ہے اور میری حیثیت ان کے سامنے اس عمر میں بھی طفل مکتب کی سی ہے

میرا خیال ہے کہ مذہب کے بارے میں انسان کو ازبس محتاط ہونا چاہئے یہ متاع ایسی کم ارز نہیں کہ ہم جب وقت چاہیں اس پر حملہ آور ہو جائیں اسی لئے مسلمانوں کو ہدایت فرمائی گئی ہے کہ تم دوسروں کے مذاہب پر نکتہ چینی نہ کرو تاکہ دوسرے لوگ تمہارے مذہب پر نکتہ چینی نہ کریں بلاشبہ یہ اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ انسانی معاشرے میں مذہبی نظریات عزیز ترین متاع شمار ہوتی ہے اور اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ تاریخ کے ہر دور میں لاکھوں انسان اس سرمایہ کی حفاظت کے لئے اپنی جانوں پر کھیل گئے

یہ درست ہے کہ یہ سائنسی دور ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ جن قوموں نے مذہب کے "توہمات سے پیچھا چھڑا کر عقلیت کے دامن میں پناہ لی ہے، اس ستم ظریف فرزانگی کے ہاتھوں آج ان کی کیا حالت ہے ان ممالک میں انسانی معاشرے کی ایک ایک چول اپنی جگہ سے ہل چکی ہے اور عظیم اخلاقی اقدار کی وہ درگت بن رہی ہے کہ دنیا الامان الحفیظ پکار اٹھی ہے کیا اسلامی

اقدار کی تضحیک کر کے ہم ایسی ہی صورت حال کو دعوت نہیں دے رہے اور اگر دانستہ یا نادانستہ طور پر ایسا ہو رہا ہے تو کیا ہم اس کے تباہ کن عواقب سے آنکھ ملانے کا حوصلہ رکھتے ہیں علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے۔

عجب آں نیست کہ اعجاز مسیحا داری ٭ عجب ایں است کہ بیمار تو بیمار تر است

ہر چند اس موضوع پر بہت کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن میں سردست اسی پر اکتفا کرتا ہوں اور آپ سے رخصت ہوتا ہوں، والسلام علی من اتبع الہدیٰ

غلام ربانی عزیز

نیاز صاحب فرماتے ہیں۔ کراچی ۲۶/۴ (۱۹۶۴ء) عزیزم سلمہ اللہ کیمبل پور کی تقریر مجھے بھیج دیجئے اور غلام ربانی عزیز کا دیباچہ بھی میں دیکھ لوں تو بتاؤں کہ اشاعت مناسب ہوگی یا نہیں، آپ کے والد محترم اب کیسے ہیں؟ خدا کرے بالکل اچھے ہوں، دعا گو نیاز" تقریر اور دیباچہ بھجوا دیا گیا۔ کراچی ۱۱/۵ (۱۹۶۴ء) عزیزم مسودات واپس کر رہا ہوں ان میں کوئی بات ایسی نہیں ہے کہ آپ اس کی اشاعت میں وقت و روپیہ ضائع کریں دعا گو نیاز "! لیجئے اب آپ وہ تقریر سنئے جس پر "وقت و روپیہ ضائع" کر دیا ہم نے، اس کا قلم زد عنوان تھا " معلم و متعلم کا روحانی تعلق "

میرے لئے غالباً یہ پہلا موقعہ نہیں ہے کہ میں اپنے خیالات کا اظہار کسی تقریر کے ذریعہ سے کروں کبھی میں نے افادہ کی صورت

ا؎ یہ مضمون حضرت علامہ "نیاز" فتحپوری نے نارمل سکول کیمبل پور میں ۲۹/۱۲/۱۹ کو ایس وی طلباء کے سامنے ۱/۲ ۱ بجے دن کے پڑھا (برق صاحب کے قلم سے یہ نوٹ ۲۹ر ہی کا ہے)

سے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور کبھی استفادہ کی صورت میں، لیکن اس لحاظ سے یقیناً یہ پہلی مثال کہ میں ایسے مجمع کے سامنے گفتگو کروں جنہیں نہ میں طالب علم کہہ سکتا ہوں نہ مُعلم، اور اس لیئے میں حیران ہوں کہ آپ سے میں اسوقت استفادہ کروں گا یا آپ کے لیئے افادہ کی صورت پیدا کر سکوں گا علاوہ اس کے یوں بھی مجھے پس وپیش ہونا چاہیئے کہ میں دفعتاً ... سے میل کے فاصلہ پر پھینک دیا گیا ہوں اور جس وقت آنکھ کھلتی ہے تو میں دیکھتا ہوں کہ جو مجمع میرے سامنے ہے وہ بہ لحاظ معاشرت ومعیشت اور شاید بہ لحاظ خیال وجذبات بھی ایک نئی دنیا کی حیثیت رکھتا ہے اور غالباً خلاف موسم نہ ہوگا اگر میں سردی کا بھی ذکر کروں جس نے ایک قفلی یخ بستہ کی طرح سینہ کے اندر میرے تمام جذبات کو بھی نقطۂ انجماد تک پہونچا دیا ہے یہ چند اسباب تھے جن کی بنا پر مجھے گفتگو کرنے میں پس وپیش تھا لیکن میرے محترم دمعزز دوست مولوی غلام ربانی عزیز اور جناب برق جیلانی کے مخلصانہ اصرار سے جن میں سے ایک سے میں محبت کرتا ہوں اور دوسرے سے ڈرتا ہوں آخرکار مجھے مجبور کر ہی دیا اور میں تماشا بنکر آپ حضرات کے سامنے آگیا

آپ حضرات سے تبادلہ خیالات کا لطف تو یہ تھا کہ میں آپ سے اور آپ مجھ سے بے تکلف ہو جاتے لیکن چونکہ یہ جلد حاصل نہیں ہو سکتا اسلیئے بلا مزید انتظار میں جو کچھ اس عدم طیاری میں کہہ سکتا ہوں وہ عرض کرتا ہوں

آپ حضرات یہاں اس غرض سے مجتمع ہوئے ہیں کہ آپ کو اپنی قوم کے بچوں کو طریق تعلیم وتربیت بتایا جائے اور اس لیے غالباً ناموزوں نہ ہوگا

اگر میں مختصراً اس تعلق سے بھی بحث کروں جو ایک معلم و متعلم کے درمیان پیدا ہونا چاہیے یہ حقیقت غالباً آپ سے مخفی نہ ہوگی کہ قوم کبھی کتابی علم سے نہیں بنی بلکہ وہ طیار ہوتی ہے۔ دماغی تربیت سے آزادی روح و ضمیر سے حریت فکر و خیال سے آپ ایک بچہ کو ایک کمزور بچہ کو اپنی جسمانی قوت سے کھیلنے سے باز رکھ سکتے ہیں لیکن اس کے دماغ کو مجبور نہیں کر سکتے کہ وہ لہو لعب میں مشغول نہ ہو، دیکھا جاتا ہے کہ ایک ہی وقت میں جب کہ ہمارا جسم کسی اور مشغلہ میں مصروف ہوتا ہے ہمارا دماغ کچھ اور کرتا رہتا ہے اس لیے میرے نزدیک صحیح تعلیم کا مقصود یہ ہونا چاہیے کہ وہ قلب و روح کو متاثر کرے اور خیال و ذہن میں تبدیلی پیدا کرے آپ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد جس وقت اپنے مدارس میں جائیں گے تو وہاں آپ کو مختلف قسم کی ذہنیتوں سے واسطہ پڑیگا اور بعض اوقات ان میں آپ کو تضاد تخالف بھی محسوس ہوگا اور یقیناً ایک صحیح معلم وہی ہے جو ان متضاد عناصر کے درمیان کوئی صورت صلح و آشتی کی پیدا کر سکے اور ایک ایسی غرض مشترک پیدا کر دے جہاں سب کا اجتماع ہو سکے اور یہی وہ اصول تعلیم ہے جس نے تمام دنیا کے اکابر و اعاظم حتی کہ انبیاء و رسل کو بھی کامیاب بنایا ہے۔

یاد رکھیے کہ انسان چونکہ فطرت کی انتہائی نزاکت تخیل ہے جو مادی شاہکار کی صورت میں پیش کی گئی ہے اسلیئے قدرت نے بھی ایک چیز سب میں ایسی مشترک ودیعت کی ہے جس پر سب کا اجتماع ہوسکتا ہے اور وہ خواہش ہے امن و سکون کی اور اسلیئے اگر آپ نے اپنے شاگردوں کے ذہن و دماغ کو اس مقصد سے آگاہ کر دیا تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ انہیں ایک مرکز پر مجتمع نہ کر سکیں

آپ کی حیثیت اس صورت میں گویا ایک ایسے پیام رساں کی ہوگی جس کا تعلق "مژدۂ بہار" سے ہے نہ اس کی سی جو "خبر بد" کی وجہ سے بوم شوم کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اس سے قبل ہم کو ہمارے ہاں کے اکابر نے بتلایا ہے کہ دل کو ہاتھ میں لینا بہترین کار ثواب ہے اگر اس تعلیم سے مذہبی عنصر کو علیحدہ کر دیا جائے تو بھی وہ ہماری مادی دنیا میں ہماری تمدنی کارگاہ میں ہماری معاشرتی و معیشتی زندگی کی تمام مشکلات کو دور کر سکتی ہے دنیا میں دو اور صرف دو جذبے ہیں جن سے موافق یا مخالف کام لیا جاتا ہے اور وہ جذبۂ محبت ہے یا جذبۂ خوف، لیکن آپ تاریخ کی ورق گردانی کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہونچیں گے کہ جذبۂ خوف کے نتائج کبھی مفید اور دیرپا نہیں ہوئے اور جذبۂ محبت اپنے اندر ایک ایسی ابدیت رکھتا ہے کہ اگر اسمیں قوت پیدا ہوجائے تو وہ ہمارے اندر صحیح معنی میں خلافت الٰہیہ کی کیفیت پیدا کر دے سکتا ہے اس لئے آپ کا سب سے پہلا فرض یہ ہونا چاہیئے کہ آپ تعلیم گاہ میں اہرمن بنکر نہ بیٹھیں بلکہ یزدانی کیفیت طاری کریں اور طلبا میں اپنی طرف سے بجائے خوف کے محبت کرنے کی کیفیت پیدا کریں کہ یہی ہے اصل بنیاد درستی اخلاق کی آپ نے شاید نظیری کا یہ شعر سنا ہوگا کہ۔

درس ادب اگر بود زمزمۂ محبتے ؛ جمعہ بہ مکتب آورد طفل گریز پائے را

اس لئے آپ کی تعلیمات کو زمزمۂ محبت والفت ہونا چاہیئے نہ کہ خشونت قہرمانی جو آپ کے سامنے ایک جسم میں تو لرزش پیدا کر سکتی ہے لیکن روح کی بغاوت کو دور نہیں کر سکتی۔

اس کا سب سے پہلا اثر یہ ہوگا کہ طلبہ کی رُوح آپ کی روح سے متصل ہو جائے گی اور اِس طرح ایک روحانی بلکہ ایتھری قسم کا تعلق پیدا کر سکیں گے اور بغیر اس کے کہ آپ الفاظ یا کتاب سے کام لیں خود بخود آپ اپنا اثر ان پر ڈال سکیں گے اور یہی ہے اصل تربیت جس کو مذہبی زبان میں "اسوۂ حسنہ" کہتے ہیں۔ جب آپ اپنا یہ اثر قائم کر لیں گے تو آپ کے لئے آسان ہوگا کہ آپ اپنے ذوق کو اس کے اندر پیدا کر سکیں اور اس طرح تعلیم و تعلم کی سب سے پہلی لیکن نہایت مشکل منزل طے ہو جائے گی۔

اب نفس کتابی تعلیم کی طرف آیئے سو اس کے متعلق مجھے زیادہ کہنا نہیں کیونکہ اصطلاحی اور فنی حیثیت سے آپ کو اس کا درس یہاں کافی طور پر دیا جا چکا ہے لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ آپ کبھی اس امر کی کوشش نہ کیجئے کہ آپ کے طلبہ میں ان کے ذوق تنقید کو محو کریں اصل چیز جس کا تعلق رُوح و ضمیر کی آزادی سے ہے صرف تنقید ہے اور اگر آپ نے کسی طالب علم میں اس کی اس فطری جستجو کو صحیح راہ پر لگا دیا تو آپ نے اپنا فرض پورا کر دیا آپ کسی کی گمراہ تنقیدی اہلیت کو صحیح راہ پر تو لگا سکتے ہیں لیکن اسے محو نہیں کر سکتے۔ اور یہ بہت کچھ منحصر ہے۔ اس امر پر کہ خود آپ نے کس حد تک اپنی آزادی تنقید کو قائم رکھا ہے۔

میرا عقیدہ ہے کہ انسان کا بہترین ذہنی ارتقاء متعلق ہے صرف جذبات لطیف سے یعنی خیال کی اس معصوم دنیا سے جہاں خود ہم اپنا ایک صنم پیدا کرتے ہیں اور خود ہی اس کی پرستش میں محو ہو کر آخر کار خود اپنے اندر ایک قسم کی صنمیت پیدا کر لیتے ہیں جسے انشا کا نقطۂ عروج کہہ سکتے ہیں اس لئے جس حد تک لٹریری تعلیم کا تعلق ہے آپ کو کوشش کرنا چاہیے کہ طلبہ میں لطافت خیال پیدا ہو اور ان کے دماغ کی وہ جمالیاتی حس جو کم و بیش ہر انسان میں پائی جاتی ہے۔ بروئے کار آجائے فطرت جمیل ہے اس کے تمام کاروبار جمیل ہیں دنیا کا ہر منظر جمیل ہے اور اس کا اقتضا یہی ہے کہ انسان بھی جمیل بنے جمیل بنائے اور آخر کار اسی کا شہید ہو کر ایک یادگار جمیل چھوڑ جائے پھر اس ودیعت فطرت کا یہ پہلو اسی وقت قوی ہو سکتا ہے جب آپ طلبہ کو نہ صرف اپنی زبان و دماغ بلکہ مختلف زبانوں مختلف دماغوں کے بہترین زائیدہ ہائے خیال سے آشنا کریں اور ایک ہی جذبہ کو مختلف اسلوب بیان کی صورت میں پیش کریں اور ان کو خود بھی پوری طرح سوچنے سمجھنے اور تنقید کرنے کا موقع دیں قبل اس کے کہ میں اس پر اظہار خیال کروں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں انشاء لطیف کے متعلق جس کا میں مبلغ ہوں ایک اعتراض کو رفع کر دوں جو عام طور پر کیا جاتا ہے آپ لوگوں نے نگارستان کے مطالعہ کے دوران میں محسوس کیا ہوگا۔ کہ بعض مضامین اس میں ایسے بھی ہیں جنہیں ہم عریاں کہہ سکتے ہیں لیکن وہ لوگ جو اس قسم کا اعتراض کرتے ہیں حقیقتاً ایک فریب میں مبتلا ہیں اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ باوصف عریاں کہنے کے بھی وہ اس سے لذت اندوز ضرور ہوتے ہیں اس کے معنی یہی ہیں کہ جس چیز کو وہ عریاں کہتے ہیں اس کے فطری ہونے سے انکار نہیں کرتے اور اگر فرق ہے تو صرف اس قدر کہ جس بات کو میں زبان سے ادا کر سکتا ہوں

وہ نہیں کر سکتے یا یہ کہ ایسا کرتے ہوئے ڈرتے ہیں یا بہ الفاظ دیگر یوں کہئیے کہ اگر یہ سب کچھ جرم ہے تو میں اپنے جرم کا اعتراف کر لیتا ہوں اور ریاکاری سے کام نہیں لیتا اور وہ منافق ہیں کہ اپنے چہرہ کے صحیح خط و خال کو سامنے لانے کی جرأت نہیں کر سکتے ادب لطیف ہو یا دنیا کی ہر وہ چیز جس میں کچھ بھی شائبہ لطافت پایا جاتا ہے اسے ہم کسی طرح تعلق جنسی سے علیحدہ نہیں کر سکتے یعنی مرد مجبور ہے کہ وہ اپنے بہتر نصف حصہ کی یاد سے کسب جذبات کرے اور اسے سرمایۂ شباب و حیات نشاط و زندگی قرار دے پھر ایک معلم اخلاق کا فرض یہ نہیں ہے کہ اس خیال کو وہ دل سے نکال دے کیونکہ ایسا ہونا ممکن نہیں بلکہ اس کا فرض یہ ہے کہ اس تعلق جنسی کے احساس کا کوئی ایسا مصرف تجویز کرے اس کا تاریک پہلو سامنے نہ آئے اور میرے نزدیک اس کا بہترین مصرف انشاء لطیف ہے جو بیان ہے صرف ہمارے جذبات محبت کا جو زبان ہے ہمارے احساس حسن و جمال کی اگر ہم اپنے جذبات کو ادا کرنے سے باز رکھے جائیں گے تو اس کا نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ وہ جذبات کوئی اور صورت اختیار کریں گے، اور بہت ممکن ہے کہ وہ صورت حقیقی معنے میں نامناسب ہے یعنی ہم تو صرف عریاں نویس ہیں لیکن ممکن ہے کہ وہ اس صورت میں "عریاں کار" ہو جائیں آسکر وائلڈ کا مقولہ ہے کہ "دنیا میں ترغیبات سے بچنے کی تدبیر یہ ہے کہ اپنے آپ کو ترغیبات کے حوالہ کر دینا چاہئیے" اس کے مادی و افادی پہلو کو قطع نظر کرنے کے بعد اگر اس کی کوئی صورت ہو سکتی ہے تو وہ صرف انشاء لطیف ہے جسے ہم ترغیبات میں پڑ جانے کی خواہش کا نہایت ہی معتدل و بے ضرر نقطہ کہہ سکتے ہیں

انشاء لطیف حقیقتاً ایک ذریعہ ہے جس کی مدد سے ہم اپنے بہت سے غیر معصوم و کثیف جذبات میں لطافت و پاکیزگی پیدا کر سکتے ہیں اور نہ صرف یہ بلکہ

تاہم فنون لطیفہ کا وجود اسی مصلحانہ و معتدلانہ اصلاح خیال پر مبنی ہے، ایک
مرد کسی حسین عورت کو دیکھتا ہے اور بالعموم سب سے پہلی خواہش اس کی یہی
ہوتی ہے کہ اس پر اقتدار حاصل کرے اور صرف اس لئے کہ اس سے نشاط
حیوانی پورا ہو پھر اگر مرد وہ واقعی مولوی قسم کا ہے جسے فنون لطیفہ میں سے کسی فن
سے لگاؤ نہیں تو وہ بہتر سے بہتر یہ صورت اس جذبہ کے تسکین کی یہ اختیار
کرے گا کہ اس سے شادی کرے اور اس طرح اس عورت کے حسن و جمال پر
قاہرانہ طور پر مسلط ہو جائے لیکن اگر یہ جذبہ کسی ایسے شخص میں پیدا
ہوا ہے جو صحیح معنے میں موسیقی کا ذوق رکھتا ہے تو وہ اپنی تسکین
اس طرح کرے گا کہ اس کی محبت کو نغمہ و زمزمہ میں تبدیل کرلے گا،
اور اس کے خیال سے اپنی موسیقی میں ایک تازہ روح پھونکتا رہے گا
اگر وہ شاعر ہے تو اس کا جذبۂ حیوانی بہترین شعروں میں تبدیل ہو جائے
گا۔ اور وہ اپنی خواہش استعلاء کو قناعت میں بدل دے گا یہاں تک کہ
اس کا اصل مقصود یہی ہو جائے اگر وہ نقاش ہے تو اپنی محبوبہ کی یاد کو صفحۂ کاغذ
پر اپنے موقلم سے نمایاں کرنے لگے گا یہاں تک کہ اس کا جذبۂ حیوانی معدوم ہو
جائے اگر وہ کوئی بت تراش ہے تو اس کا ذوق بت تراشی ہیجان میں
آجائے گا اور وہ صرف اس بت کو اپنا معبود سمجھنے لگے گا جو حقیقتاً خود اس
کے جذبات کی متشکل و مجسم صورت ہے اور اگر وہ ادیب یا انشاء پرداز ہے
تو وہ ان جذبات کو اپنی حسن تخیل تزئین بیان اور تہذیب۔ انشاء میں
صرف کرے گا۔ یہاں تک کہ اس کا مدعا بجائے پرستش محبوب کے تیاری

خیال رہ جائے گا پھر دنیائے شعر و ادب نقش و موسیقی کے بہترین شاہکار کا مطالعہ کرو تو تم کو معلوم ہو گا، کہ یہ سب داستانیں ہیں اسی ایک جذبہ کی جس کو اگر اس طرح ظاہر نہ کیا جاتا تو یقیناً وہ کسی نہ کسی معصیت میں ضرور تبدیل ہو جاتا اور دنیا بجائے امن و سکون کے تخریب و فساد سے بھر جاتی اسی لئے اگر انشاء لطیف میں کہیں کہیں عریانی نظر آ جاتی ہے تو وہ ایک آرٹ ہے جس کا مقصود یہی ہے کہ جذبات کی گمراہی کو دنیا سے دور کر دے اور اور انسان کو بتائے کہ ہم کیونکر دنیا کے مختلف مناظر اور ان مناظر سے پیدا ہونے والے مختلف جذبات کو صحیح راہ پر لگا سکتے ہیں۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ جیسے ایک سیلاب ہمارے سامنے رو نما ہو۔ اور ہم اس کی تباہ کاریوں سے بچانے کے لئے چند راہیں اور ایسی پیدا کر دیں جہاں سے وہ آسانی سے گزر جائے اور اصل تعمیر کو نقصان نہ پہنچا سکے اسی لئے اگر آپ تفتیش کریں گے تو اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ وہ شخص جسے آپ عریاں نگار کہتے ہیں اپنی اخلاقی زندگی کے لحاظ سے ایسا قابل الزام نہیں ہے جتنا وہ زاہد خشک جو ایسی انشاء کا مطالعہ تو گوارا نہیں کرتا لیکن اس انشاء کے ایک ایک فقرہ پر جوانی عمل کر کے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے میرا تجربہ تو یہی ہے کہ وہ لوگ جو انشاء لطیف کے دشمن ہیں حقیقتاً وہی چھپے جو معصیت کے کھلے بہت جری ہیں اور غریب انشاء لطیف والے وہ ہیں جو اپنے دل کے کانٹے کو یوں زبان سے نکالتے رہتے ہیں اور اخلاقی دنیا کا کوئی جرم ان سے سرزد نہیں ہوتا۔

یہاں سے یہ سوال بھی غالباً حل ہو جاتا ہے کہ انتشار لطیف کسے کہتے ہیں اور وہ نشاط انسانی کا کیسا معصوم مشغلہ ہے انتشار لطیف کی تہذیب و ترقی کے لئے جس قدر نفس کی پاکیزگی اور طہارت خیال کی ضرورت ہے اسی قدر وسعت مطالعہ کی بھی ہے اور اس لئے میں نے اس سے قبل عرض کیا تھا کہ ایک شخص جتنا غائر مطالعہ دوسری زبانوں کا کرے گا اتنا ہی زیادہ یہ ذوق بلند ہو سکے گا اس سلسلے میں جہاں تک شاعری کا تعلق ہے مجھے یہ کہنے میں مطلق پس و پیش نہیں ہو سکتا کہ بحیثیت ہندوستانی ہونے کے ہمارا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ ہم ہندی زبان کی شاعری کا مطالعہ کریں اور خصوصیت کے ساتھ اہل پنجاب کو کہ اگر تحقیق کی جائے تو ان کی زبان کا بہت گہرا تعلق برج بھاشا سے ثابت ہو سکتا ہے افسوس ہے کہ میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ تفصیل کے ساتھ اس شاعری کی خوبیوں سے بحث کروں لیکن مختصراً اتنا ضرور عرض کروں گا کہ آپ اس شاعری کی حلاوت و لطافت کو کیا پوچھتے ہیں جس میں عورت کی طرف سے اظہار عشق و محبت کیا جاتا ہے دنیائے عشق و محبت کا مسلمہ نظریہ ہے کہ محبوب کے لطف و کرم سے زیادہ ظلم دنیا میں کوئی نہیں یہاں تک کہ ایک شاعر کہتا ہے اس کا دیکھنا نگہہ التفات ہے پھر آپ ہی بتایئے کہ جس زبان کی شاعری میں صرف اسی التفات اسی لطف و کرم کا بیان ہو اس کے اثرات کتنے عمیق ہوں گے یہ خصوصیت تمام دنیا کی زبانوں میں صرف ہندی شاعری[1] ہی کو حاصل ہے اور اس لئے اس میں وہ تمام

---

[1] سندھی اور اسرائیکی شاعری بھی انہی خصوصیات کی حامل ہے (انیس)

وہ تمام نزاکتیں وہ تمام لچیلی کیفیات پائی جاتی ہیں جو ایک عورت کی طرف سے اظہار تعشق میں بے پناہ محور پر پائی جا سکتی ہیں اور جذبات کی وہی شدت ہے جو قدرتاً ایک عورت اور محبت کرنے والی عورت کے دل میں رونما ہو سکتی ہے میں نے ایک کتاب اس موضوع پر لکھی ہے اگر آپ کو شوق ہو تو اس کا مطالعہ کر سکتے ہیں اور پھر آپ خود اس کی تصدیق کریں گے کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ کس حد تک صحیح ہے -

اب میں آپ حضرات کا زیادہ وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھتا اور اس آزمائش و ابتلا کی ساخت سے ان الفاظ کے ساتھ گزر جانا چاہتا ہوں کہ خدا کرے آپ یہاں سے تعلیم و تعلم کے صحیح مقصود کو سمجھ کر جائیں اور دنیا میں -

اپنی زندگی کا مقصود صرف محبت و الفت قرار دیں
کہ جنت اسی کا نام ہے اور یہی ہے وہ فردوس جس کو
غلطی سے مولویوں نے خدا جانے کیا سے کیا سمجھ رکھا ہے
اور سمجھا رہے ہیں" (By "NIAZ")

اس تقریر پر ڈاکٹر برق کا تاثر اصل مسودہ میں موجود ہے یہ اور بات ہے کہ " مصلحتِ وقت " کے تحت اسے قلم زد کر دیا گیا ہے تاہم میں اسے یہاں نقل کر دینے کی جسارت کر رہا ہوں -

ا؎ بقلم ڈاکٹر برق

" دورانِ مضمون میں تاثرات وکیفیات کی ایک
متلاطم دنیا نمایاں ہو رہی تھی جس میں برق سراپا جذب
ہو رہا تھا کاش کہ یہ کیفیت لمحۃ البرق سے زیادہ دیرپا نہ
تھی اس لئے جمیل تمناؤں کی شگفتگی نے تکیف آباد سکول
کو محشرستانِ حسرت دیاس میں بدل دیا "

برقؔ

حیرت شملوی

(۱۹۰۶ء – ۱۹۶۴ء)

جس نے اپنے مخصوص اندازِ بیان سے شملوی دلوں کو گرمایا، شملہ میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ سے گریجویشن کیا، فوجی اخبار شملہ کے نائب مدیر رہے۔ وہاں سے مرکزی حکومت نے دلّی بلایا۔ اسمبلی اور سکریٹریٹ میں کام شروع کیا ہی تھا کہ فالج کا حملہ ہوا، ۴۴ء سے ۶۴ء تک بستر گیر رہے، بیس سالہ طویل علالت نے ان کی شہرت کو ضرور کھنڈر کر رکھ دیا تھا، مگر ذہن کچھ اور جِلا پا گیا۔ مرحوم کا مجموعۂ کلام

دیوانِ حیرت شملوی

کے عنوان سے بہت جلد پیش کیا جا رہا ہے۔ حیرت کے بارے میں مشہور محقق و نقّاد مولانا امتیاز علی عرشی فرماتے ہیں۔

"حیرت اس وقت کے تمام غزل گویوں کے پیشوا ہیں"

حیرت شملوی

چھوٹی بحر میں غزل کے اُستاد تسلیم کرلئے گئے تھے
مولانا عرشی نے کچھ یوں ہی نہیں کہہ دیا تھا کہ
آپ موجودہ دور کے تمام غزل گویوں کے پیشوا ہیں اس
اُستاد کامل کا مجموعۂ کلام

کلیات حیرت شملوی

بہت جلد شائع کیا جارہا ہے

حیرت شملوی اکادمی

کا

آئندہ لائحہ عمل

زیرِ ترتیب و طبع :-

۱- کلیات نظم حیرت شملوی
۲- مکاتیب حیرت شملوی (اُردو)
۳- مکاتیب حیرت شملوی (انگریزی)
۴- مکتوبات مشاہیر پاک و ہند بنام حیرت شملوی
۵- ملفوظات حیرت شملوی
۶- مضامین حیرت شملوی
۷- حاشیے حیرت شملوی
۸- ٹیگور کی کہانیاں مترجمہ حیرت شملوی
۹- تذکرۃ الشعراء از حیرت شملوی
۱۰- بنیادی اُردو قاعدہ از حیرت شملوی
۱۱- بنی اسرائیل کا چاند (ناول) ترجمہ " "
۱۲- منتخب اشعار (فارسی) از حیرت شملوی
۱۳- منتخب اشعار (اُردو) از حیرت شملوی
۱۴- انتخاب حیرت (نظم)
۱۵- انتخاب حیرت (نثر)
۱۶- حیرت شملوی مشاہیر کی نظر میں
۱۷- یادش بخیر (تذکرہ) از حیرت شملوی
۱۸- سوانحعمری حیرت شملوی مرتبہ انیس شاہ جیلانی
۱۹- حیرت تصویروں میں
۲۰- نوازش نامے (مطبوعہ) مرتبہ سید انیس شاہ جیلانی
۲۱- مجموعہ کلام رئیس امروہوی (غزلیات)
۲۲- حرفِ پریشاں - از پروفیسر نظیر صدیقی
۲۳- مکتوبات نیاز فتحپوری مرتبہ انیس
۲۴- قاضی احسان احمد شجاع آبادی
۲۵- ریاض و نیاز از سید مبارک شاہ جیلانی
۲۶- روزنامچہ ۱۹۵۷ء رئیس احمد جعفری
۲۷- مکاتیب عبدالماجد دریا آبادی بنام رئیس احمد جعفری
۲۸- مکتوبات روش صدیقی بنام سید مبارک شاہ جیلانی
۲۹- مکتوبات مولانا اشرف علی تھانوی بنام فخر الدین شاہ جیلانی و شبیر محمد شاہ جیلانی -
۳۰- خطوط مشاہیر بنام رئیس احمد جعفری
۳۱- کالا کافر - مرتبہ سید انیس شاہ جیلانی
۳۲- نیاز فتحپوری (مطبوعہ) مرتبہ " "
۳۳- مکاتیب رئیس احمد جعفری بنام سید مبارک شاہ جیلانی
۳۴- رئیس احمد جعفری ... [illegible] ... مرتبہ انیس
۳۵- مولوی عبدالحق " " " " " "

حیرت شملوی اکادمی
محمد آباد - ڈاکخانہ سنجر پور - ضلع رحیم یار خاں

قیمت دو روپے